رخسانہ نگار عدنان

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور منہ کا ذائقہ بے حد کڑوا ہو رہا تھا جیسے میں نے نیم کی ڈھیروں ڈھیر گولیاں نگل لی ہوں یا اور کوئی زہریلی شے۔

وہ زہر ہی تو تھا جو میں نے نگلا! زہر؟

مگر وہ تو اسے تریاق کہہ رہے تھے۔۔۔ آب حیات۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔ مجھے یاد نہیں آ رہا میرا سر یوں چکر کھا رہا تھا جیسے میں کسی گول گول گھومنے والے جھولے میں بیٹھا ہوں۔

مگر رات تو میں کسی ایسے جھولے میں نہیں بیٹھا تو پھر؟

میں نے زور سے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر سر کو جھٹکا سا دیا اور اس اذیت ناک کیفیت سے نکلنے کی کوشش کی مگر بے سود۔۔۔

ایک ان چکروں کی اذیت ناک حالت دوسرا یہ کڑوا کسیلا زہر جیسا منہ کا ذائقہ اور تیسرے ہڈیوں کے گودے میں اترنے والی یہ شدید سردی اور چاروں اور منڈلاتی گہری سرمئی دھند۔۔۔ یہ دھند تھی یا بادل۔۔۔ ان میں تمیز کرنا مشکل تھا یہاں پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ

ناولٹ

آپ کے اردگرد دھوئیں کی طرح پھیلتی یہ دھند ہے یا بادل۔۔۔ تھوڑی تھوڑی سی دیر بعد تو بادل زمین پر اتر آتے تھے اور جو آپ کسی بادل کی لپیٹ میں آجائیں تو بس نچوڑنے کی کسر رہ جاتی ہے' ورنہ تو آپ کو سارے کا سارا یہ تر کر جاتے ہیں۔

"افوہ! کیا مصیبت ہے میں آخر ادھر کیوں بیٹھا ہوں اور بیٹھا خوامخواہ کی یہ مصیبت جھیل رہا ہوں۔ اٹھ کر کمرے میں کیوں نہیں چلا جاتا اور کچھ نہیں تو باتھ لے کر ان چکروں سے تو نجات حاصل کروں اور منہ کے کسیلے پن سے بھی۔"

اردگرد تھوڑی تھوڑی لوگوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی اگرچہ ان کی تعداد دن بھر میں ہونے والے رش کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی اور رش تو یہاں شدید گرمی میں زوروں کا پڑتا ہے اور۔۔۔ زوروں سے یاد آیا مجھے تو زوروں کی بھوک بھی لگ رہی ہے کل رات کو بھی میں نے کچھ نہیں کھایا تھا یا — کھایا تھا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا تھا۔۔۔ ایک تو یہ چکر میں گھبرا کر بالآخر اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے چکر کے ساتھ برفیلی ہوا نے ڈگمگا دیا۔ میں نے سر نیچے کیا۔

میرے پیروں میں سلیپر تھے پلاسٹک کے جو شاید ۔۔۔ اور میرے پیر نیلے ہو رہے تھے۔ اردگرد پھیلی دھند اور بادلوں کے غبار میں ایک فٹ تو کیا ایک ہاتھ سے آگے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں اتنی دور تک کیسے جاؤں گا' جبکہ یہ چکر تو شاید مجھے دو قدم بھی نہ چلنے دیں اور سردی۔۔۔ سردی تو مجھے یہیں جما ڈالے گی کٹ کٹ میرے دانت بجے تھے اور پورے جسم پر کپکپی سی طاری ہونے لگی تھی۔

حالانکہ اس چڑھائی اترائی پہ میں روزانہ دن میں دس بار تو کسی ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا اترا چڑھا کرتا تھا بھاری طبیعت اور رت جگے۔

"رت جگے ۔۔۔ میری نظروں کے سامنے رات کا منظر کیا آیا اگلا قدم اٹھانا ناممکن سا ہو گیا' چکروں نے بھی مجھے کمزور پڑتا دیکھ کر پوری شدت سے حملہ کیا اور میں لڑکھڑاتے قدموں گرنے لگا اور گر کر مجھے کدھر تک لڑھکتے جانا تھا۔۔۔ میں نے پیچھے مڑ کر اس مقام تک اندازہ لگانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس طرح رولنگ اسٹون کی طرح لڑھکتے چلے جانا کسی فلم کے گانے میں ہیرو ہیروئن کا دلکش سین تو ہو سکتا ہے مگر حقیقی زندگی میں یوں مجھ اکیلے کا لڑھکنا اردگرد چلتے پھرتے لوگوں کے لیے ہنسی کا فوارہ بننے کا باعث بن سکتا ہے میں نے بے اختیار ہی ہاتھ بڑھا کر پاس سے گزرتے بچہ ہتھ گاڑی والے کی گاڑی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔

"صاب! گاڑی چاہیے؟" اس پہاڑی آدمی کی آواز صور اسرافیل کی طرح میرے کانوں سے ٹکرائی تھی مگر۔۔۔" وہ کہہ کر جھجک سا گیا تھا ظاہر ہے میرے ساتھ کوئی بچہ تو تھا نہیں اور نہ کوئی بھاری سامان اور میں خود دیکھنے میں ہی نہیں' ہوں بھی ہٹا کٹا صحت مند بھرپور جوانی کے ساتھ۔

"ہاں! لے چلو گے؟" میں نے اسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا اور اچک کر اس بچہ ہتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"چلو نا سردی دیکھی ہے" میں اسے یوں حیران سا کھڑا دیکھ کر جھلایا اور سردی۔۔۔ اف میں نے شرٹ اور ٹراؤزر کے اوپر فقط اپنی گرے کارڈیگن پہن رکھی تھی اور سردی سے کپکپا رہا تھا اور اس نے اس نے ملیشیا رنگ کے گھسے' رنگ اڑے شلوار قمیص کے اوپر پوری آستینوں کا سوئیٹر اور ایک گندی سی پرانی گھسی ہوئی اونی چادر سے سر کندھے' سینہ ڈھانپنے کی کوشش کی ہوئی تھی اور اس کے پیروں میں ٹخنوں تک اٹھی شلوار کے نیچے اس کے دودھیا پاؤں نیلے ہوئے جا رہے تھے۔

فاصلہ تھا کتنا۔۔۔ تھوڑا بہت تو میں بھی طے کر آیا تھا۔

"چالیس روپے۔" اس نے گاڑی روک کر کہا تو مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔

"ان چند قدموں کے چالیس روپے؟" مگر مجھ سے کچھ بولا نہیں گیا یہ نہیں کہ اس جگہ چالیس روپے کوئی بہت بڑی رقم تھی یہاں تو مجھے کھنکارنے کا بھی کوئی نہ کوئی معاوضہ دینا پڑتا تھا سوائے اس سردی اور یخ ہواؤں کے۔۔۔ جبکہ یہ بھی فری نہیں اتنی دور آنے کے لیے کرایہ۔

"اچھا تم ٹھہرو میں لاتا ہوں۔" ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھے پتا چلا۔ والٹ تو میرے پاس ہے ہی نہیں۔

میں اسے کھڑا کر کے پلٹا اور پیسے لے کر آ گیا۔

"یہ لو۔۔۔ آج مجھے پتا چلا ہے کہ قدم۔۔۔ چند قدم جنہیں ہم کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ اپنی طاقت کے زعم اپنی جوانی کے گھمنڈ میں۔۔۔ نہ چل سکیں تو ان قدموں کی قیمت دینا پڑتی ہے۔ اس صبح کا پہلا سبق مجھے یاد رہے گا زندگی بھر۔" میں اسے پیسے دیتے ہوئے منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ وہ بھی انگریزی میں بے چارہ میرا منہ دیکھا تو کنے لگا۔

"اور سنو' یہ لو۔" وہ جانے کو مڑا تو مجھے خیال آیا۔

"میں نے ہاتھ میں پکڑی جرابوں کا ایک جوڑا جو میں اپنے بوٹوں میں سے نکال کر لایا تھا۔ اسے تھما دیا۔

"ہی ہی۔۔۔ شکریہ صاب۔" پہلی بار اس کے لمبے چوڑے سفید اخروٹ کی مانند چمکتے دانت موٹے موٹے ہونٹوں کی بھدی دیوار سے جھانکنے تھے۔

"پہنو انہیں ابھی۔" وہ جلدی سے جرابیں لے کر قمیص کی کمر والی جیب میں رکھنے لگا تو میں نے فوراً" حکمیہ انداز میں کہا وہ تھوڑا حیران تھوڑا خوف زدہ سا ہوا اور تھوڑا سوچنے کے بعد جرابیں پہننے لگا تو مجھے لگا میرے پیروں کو سہولت بھری گرمی سی مل گئی ہو' جرابیں پہن کر اس نے دوبارہ اپنے پیروں کو دیکھا۔

"شکریہ صاب۔" دوسری بار اس کے دودھیا دانت ہونٹوں کی منڈیر پر چمکے اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے واپس اسی رستے کی طرف چل پڑا جدھر سے مجھے لے کر آیا تھا۔

میں سانس لے کر مڑنے لگا اور گرتے گرتے سنبھلا موقع دیکھتے ہی چکر کا جھولا آیا تھا اور مجھے یاد آیا میں کس الجھن میں گرفتار ہوں۔

بادل دھوئیں کی طرح اترنے لگے اور لمحوں میں وہ حصہ جہاں ابھی ہتھ گاڑی والا کھڑا تھا' بھیگ گیا میرے قدموں تک یہ گیلا پن آیا تھا' میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان تو کہیں تھا نہیں' بادل اور سرمائی دھند میرے دانت کٹکٹائے اور میں ٹھٹھرتا کانپتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ کمرے کی نرم گرم فضا نے کسی محبت کرنے والی ماں کی طرح بانہیں پھیلا کر مجھے اپنی آغوش میں لیا تھا' سامنے پھیلا ہوا نرم گداز اور مخمل کی نرم گرم پھولی پھولی رضائی مجھے مسکرا کر خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

مگر مجھے — نہانا تھا ابھی۔۔۔ یہ چکر' منہ کا کڑوا پن اور غلاظت گندے ہونے کا وہ کریہہ احساس جس نے یہ جگہ چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اس سے چھٹکارا پانا سب سے پہلے ضروری تھا' میں نے اپنے کپڑے لیے اور باتھ روم میں گھس گیا صد شکر کہ گرم پانی آ رہا تھا ورنہ تو۔؟ پانی چیک کر کے میری طبیعت سرشار ہو گئی اور

میں نے نل ٹونٹی کھول دی بھاپ اڑاتا پانی ٹب میں بھرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"ارے گھونچو! اٹھو ادھر کیا تو پوستیوں کی طرح سونے کے لیے آیا ہے کیا گھوڑے گدھے خچر سب بیچ باچ سو رہا ہے دس منٹ سے آوازیں لگا رہا ہوں۔" یہ عامر تھا جس نے دیوانوں کی طرح۔ رضائی اتار کر پرے پھینکتے ہوئے مجھے جھنجوڑا تھا۔

"سونے دو مجھے 'تمہیں کیا تکلیف ہے؟" میں نے ٹانگیں سکیڑتے ہوئے رضائی کھینچ کر اوپر لینے کی کوشش کی جسے اس نے مجھ سے پہلے دبوچ کر دوسرے بیڈ پر اچھال دیا۔

"آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" وہ غصے میں چڑ کر بولا۔

"مسائل میں تو گھرے ہوئے تم لوگ مجھے لگ رہے ہو۔" میں ذرا سا اٹھتے ہوئے رضائی کھینچنے کی نیت سے آگے کو ہوا۔

"اچھے بھلے تو تم ہمارے ساتھ آئے ہو تو اب کیا دماغ میں خناس بھر گیا ہے اور جس طرح تم نے رات کو پی ہو کیا وہ۔۔۔ وہ اتنا شرمندہ ہونے کے بجائے مجھے تاڑتے ہوئے بولا تو مجھے اتنا شدید غصہ آیا کہ چند لمحے مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا لب کاٹتے ہوئے غصہ پینے کی کوشش کرتا رہا میری آنکھوں سے دھواں سا نکلنے لگا تھا جلتا ہوا دھواں۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر رضائی کھینچی اور ٹانگوں پر پھیلا لی۔

"اب گوتم بدھ کی طرح کس گیان میں گم ہو گئے ہو تمہیں ہوا کیا ہے؟" وہ اسی چڑے ہوئے انداز میں پھر سے رضائی کھینچنے کی نیت سے آگے بڑھا تو میں نے گھٹنوں پر پھیلی رضائی پر اپنے ہاتھ مضبوطی سے رکھ لیے۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے سونے دو نیند آ رہی ہے۔" میں چاہتا تھا وہ یہاں سے کم از کم اس کمرے سے میری نظروں سے کہیں دور دفعان ہو جائے اور اپنے اس گریز اس طیش کی وجہ بظاہر مجھے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

مگر پھر بھی میں ان میں سے کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ حالانکہ اس طرح کی خواہش یا کم از کم احساس ان کو ہونا چاہیے تھا' جبکہ عامر کے رویے سے ایسا کچھ بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا تو پھر مجھے ہی کچھ دیر کو منہ سر چھپا کر لیٹ جانا چاہیے تھا۔ یوں بھی نہانے کے بعد جو لیٹا تو اتنی گہری اور میٹھی نیند آ گئی تھی کہ پھر رات بھر کی بے آرامی میں ابھی ایک دو گھنٹے اور سونا چاہتا تھا اور وہ میرے سر پر یوں کھڑا تھا' جیسے مجھے گود میں ہی اٹھا کر لے جائے گا۔

"میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں' ہم یہاں سونے کے لیے نہیں آئے۔" وہ میرے یوں جمائی لینے پر چڑ کر بولا "اور جو کر رہے ہیں اس کے لیے بھی نہیں آئے۔" میں طنز سے بولا تو وہ مجھے کڑی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"یہ تم پہلے سے ایسے تھے اور بیچ میں تمہاری یادداشت آئی مین میموری گم ہو گئی تھی' یا ابھی تمہیں اپنی ان خفیہ صلاحیتوں کا علم یہاں آ کر ایک رات کو ہی ہوا' وہ بھی جواباً طنز بھرے لہجے میں بولا تو میں ایک بار پھر لب کاٹ کر رہ گیا۔

"اچھا اٹھو اب یہ نازنینوں جیسے نخرے ختم کرو' چلو ناشتہ نہیں کرنا' بارہ بجنے کو ہیں۔" اس نے ایک بار پھر رضائی میرے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی۔

"میں کوئی نخرے نہیں کر رہا' ابھی مجھے صرف سونا ہے ناشتے کی طلب نہیں' جب ہو گی خود اٹھ کر کر لوں گا تمہیں میری اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے۔" اب کہ میں نے بھی ہر لحاظ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے روکھے لہجے میں کہا تو وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا' جیسے میری دماغی حالت کی درستگی پر اسے شک سا ہو رہا ہو۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے منہ سے اظہار کرتا۔

اسی وقت دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔

"افوہ یہ تم دونوں کیا چرسیوں اور چوہوں کی طرح کمرے میں گھسے بیٹھے ہو باہر کیا قیامت موسم ہو رہا ہے دیکھو تو سیزن کی پہلی سنو فال ہو رہی ہے باہر۔ اف دیکھنے والا منظر ہے اٹھو آؤ نا باری تم بھی۔" رویا کسی بھی اجازت کے بغیر دروازہ دھڑاک سے کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔

اسے کوئی بھی دروازہ کھولنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے کاٹ دار نظروں سے اسے دیکھا۔

ریڈ ٹائٹ جینز کے ساتھ بلیک اور بلیو کنٹراسٹ کا اس کا تنگ بلکہ پھنسا ہوا بلاؤز سا تھا اور اس کے اوپر ڈھلکتی گرم جرسی تھی یا شال تھی' مجھے سمجھ میں نہ آ سکا' جو اس کی برہنہ ہوتے ودھیا کندھوں سے پھسل پھسل جا رہی تھی۔

"ہاں بس آ رہا ہوں ان سادھو جوگی کو جگانے آیا تھا مگر جناب کا اوپری پورشن کسی اور ہی پرواز میں لگتا ہے سو انہیں ان کے حال پر چھوڑو ہم چلتے ہیں باہر۔" عامر نے بڑی خوش دلی سے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام کر اپنے ساتھ لگایا اور دونوں ہنستے کھلکھلاتے ان کی سرگوشیاں کرتے ایک ساتھ باہر نکل گئے۔

"یہ آخر مجھے ہوا کیا ہے؟" ان کے باہر نکلتے ہی جیسے میری نیند سستی اور غنودگی بھی ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی میں بے چین سا ہو کر بستر سے اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔

بھاری مخملیں پردے کو ایک طرف ہٹا کر اس کا گلاس ونڈو ایک طرف دھکیلا۔

برفیلی سرد ہوا کا تیز جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا تھا اور نرم نرم سی برف بھی۔

باہر واقعی برف باری ہو رہی تھی۔

"واقعی ایسے قیامت موسم میں سونا تو دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہو گی۔" دوسرے لمحے میں موسم پوری طرح مجھے اپنے حصار میں لے چکا تھا میں اگلے لمحے گرم کپڑے پہن باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

باہر کاریڈور میں دور تک سناٹا تھا سنٹرلی ہیٹڈ ہونے کے باوجود روز والی گرماہٹ مفقود تھی' ہلکی ہلکی سی خنکی اور دھندلا سا غبار کاریڈور کی نیچی چھت ہال اور بند کمروں کے ارد گرد چکراتا پھر رہا تھا۔

"سر بریک فاسٹ ڈائننگ ہال میں لیں گے یا روم میں؟" مستعد ویٹر برق رفتاری سے میرے راستے میں آیا تھا۔

سفید براق یونیفارم بے داغ تھا اس کی سرخ و سفید رنگت کی طرح اور کنچوں کی طرح ہری نیلی آنکھیں متحرک تھیں۔

"شکریہ میں باہر جا رہا ہوں۔" میں رکھائی سے کہہ کر آگے نکل آیا تو وہ گردن کھجانے لگا "اچھا خاصا سوڑہ ہے یہ تگین خان بھی۔ اس وقت تو میں سستے میں چھوٹ آیا تھا ورنہ تگین خان کے ہاتھوں بچ نکلنا کمال دکھتا تھا اور میں یہ کمال کر آیا تھا یوں بھی رات کے واقعہ کے بعد تگین خان کی شکل پوری کی پوری میں نظر بھر کر اب شاید ہی دیکھ سکوں جیسے۔۔۔ عامر رضوان فہد اور روبی۔

میں بے چاپ قدموں سے چلتا باہر نکل آیا۔

ریسپشن پر بیٹھے دلبر خان نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں اپنے حواسوں میں نہیں اور یکبارگی تو بیرونی دروازہ دھکیل کر باہر نکلتے ہی جس طرح موسم کی تندی نے میرا استقبال کیا' مجھے دلبر کی نظروں سے کچھ گلہ نہ رہا۔

ہلکی پھلکی روئی کی مانند بے آواز بے دم سی اترتی وہ نرم روئی بڑے آرام و سکون سے ہوٹل کی بیرونی حدود سے مال روڈ کی تاحد نظر آتی سڑک پر بچھتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ یخ بستہ ہوا چلتوں کے قدم اکھاڑنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے ایک گہرا سانس لے کر برفیلی نم باس کو اپنے اندر اتارا اور دونوں زینے پھلانگتے باہر نکل آیا۔ سفید روئی میرے جاگرز کے ساتھ چپکنے لگی۔

موسم کے تیور بتا رہے تھے اب یہ برف رات تک اور ساری رات بڑی دل جمعی سے برسے گی' بشیر ہوٹل کا پوری حلوہ اور گرما گرم پراٹھوں کے ساتھ اچار چنے اتنے لذیذ اور یاد رکھے جانے کے قابل تھے کہ لاہور جانے کے بعد اکثر میں صرف اسی ذائقے کو پانے کے لیے میں کتنے ہی لاہوری ناشتے کے ٹھکانے بدلتا رہتا مگر

ایسا ذائقہ ایسا لطف مجھے صرف اس ہوٹل کے کھانے میں آکر ملتا تھا۔
بصیرت خان نے گرم گرم پراٹھے اور اچار چٹنے کی پلیٹ میرے آگے رکھی اور سوسو کرتا واپس چلا گیا۔
دکان کے سینٹر میں ہیٹر بھی چل رہا تھا اور بیرونی دروازے کے پاس بڑی سی کوئلوں والی انگیٹھی بھی' اس کے باوجود دکان کی فضا بس بیٹھنے کے قابل ہی ہو سکی تھی۔
میں نے سڑک سڑک پیتے ہوئے چائے کی تیسری پیالی رکھی تھی اور چوتھی کا آرڈر دینے کا سوچ رہا تھا جب وہ دکان کے ادھ کھلے دروازے کے آگے پڑے گندے پردے نے ہوا میں لہرا کر باہر کا منظر دکھایا۔
برف اب ہر طرف اڑتی پھر رہی تھی اور وہ...... وہ سیاہ لباس میں ہاتھ میں گجروں والے تاج سے لیے اس اڑتی برف میں مزے سے چلتی نظر آئی۔
" بصیرت خان اندر سے بل پکڑ لینا۔" میں پیسے میز پر پھینک کر باہر کی طرف لپکا۔
باہر ہر طرف ہوا کی پھنکار تھی یا وہ برستی برف کی لحہ بہ لحہ دبیز ہوتی چادر...... وہ کہیں نہیں تھی۔ میں دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
"کہاں گئی وہ؟" میں دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھتا سڑک پر نکل آیا۔
میں سڑک کے بیچوں بیچ ہونقوں کی طرح کھڑا تھا' سر پر لی ہوئی گرم ٹوپی اور ہاتھوں کے دستانے جیسے اپنے وجود کی گرمی کہیں کھو چکے تھے' تیزاتی کی طرح ہوا میرے ہاتھوں اور سر میں گھس رہی تھی۔
"کدھر گئی وہ ایک ہی منٹ میں۔" میں پریشان سا واپس چل پڑا۔
"اس کو ڈھونڈنا تو کچھ بھی مشکل نہیں اگر ابھی جا کر میں تگین خان سے کہوں تو......" اگلے بے بس قدم نے بڑی طمانیت سے مجھے راہ سجھائی۔
"تھو" میں نے بے اختیار سڑک کے کنارے تھوکا تھا۔
"لو وہ جا رہی ہے۔" میں جو جی پی او کی طرف سے مڑتے ہوئے واپس اپنے ہوٹل کی طرف جا رہا تھا وہ ہوٹل میٹروپول کی چڑھائی چڑھتے ہوئے دکھائی دی۔
میں لپکا اور تیز قدموں کے بعد ہی ٹھٹک کر سوچنے لگا۔
"یہ وہی تو ہے......" میں برستی برف سے بے خبر کھڑا تھا۔
"مگر اس کے باوجود مجھے اس سے ملنا چاہیے۔" میں نے دل میں فیصلہ کیا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگا' وہ کسی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی اچھلتی شاید کچھ گنگناتی اوپر ہی اوپر چلی جا رہی تھی اور اس کے تعاقب میں میری سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں اور پنڈلیوں کے ساتھ جیسے کوئی پتھر باندھنے لگا۔
"اے سنو بات سنو......" میں اس سے شاید تین چار فٹ کے فاصلے پر تھا' جب میں نے اسے زور سے پکارا وہ جھٹکے سے مڑی اور میری طرف دیکھ کر لحہ بھر کو ٹھٹک سی گئی پھولوں والے وہ تاج ـــ اس نے ایک کلائی سے دوسری میں منتقل کیے۔
"کیا ہے کیوں پیچھے آتا ہے امارے۔" وہ دوری سے کرخت پہاڑی لہجے میں چلائی۔
"بات سنو میری میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" میں ہانپتا سانسوں پر قابو پاتا سردی سے ٹھٹھرتا اس تک بمشکل پہنچا تھا۔
اس کا سرخ و سفید رنگ اس دودھیا برف کی رنگت کو بھی شرما رہا تھا۔
"اوں ہوں......" میں دھونکنی کی مانند چلتے سانس پر قابو پاتے اس کے پاس ہی دیوار کے ساتھ بنی منڈیر پر بیٹھ گیا۔
"کیا بات کرے گا ام سے۔" وہ ایک دم ماتھے پر گہرے گہرے بل ڈالتے ہوئے تنفر سے بولی۔
"آؤ ادھر بیٹھو۔" میں نے بے تکلفی سے اسے اپنے ساتھ بچی ہوئی جگہ پر بیٹھنے کو کہا تو بے تحاشا نفرت سی اس کی آنکھوں میں امڈ آئی۔
"بات سنو صاب' امارا یہ دھندہ رات کا ہے رات کو بلوا بھیجنا' ام آئے گا جاؤ تم یہاں سے امارے پیچھے مت آنا' اتنی نفرت اتنی چنگاریاں تھیں اس کے لہجے میں کہ پل بھر کو میں یہ بھی بھول گیا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں اور کس کے سامنے بیٹھا ہوں اور کس کے پیچھے آیا ہوں اور کیوں؟
"رات کو بلوا بھیجنا...... رات کو بلوا بھیجنا......"
سامنے تنی کھڑی سنگلاخ سرمئی بھوری چٹانوں کے پتھر اڑ اڑ کر ایک ہی جملہ دہرانے لگے ایک ایک پتھر چٹان سے سچ سچ اتر رہا تھا اور مجھے سنگسار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا اور میں...... سن بالکل سن بیٹھا تھا۔
برف میرے اوپر گرتی جا رہی تھی اور میں اوپر چٹان پر گم ہوتے اس تکتے کو تکے جا رہا تھا جدھر وہ گم ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کی عمر اس وقت کتنی تھی؟" کئی بار کا پوچھا ہوا سوال سیما آپی نے اس اشتیاق سے پوچھا' جیسے پہلی بار پوچھا تھا۔
"اے لوکی کوئی نو دس سال عمر تو کم سنی کی تھی پیا شعور تو جیسا پیدائش کے ساتھ ہی پختہ ہو تا شروع ہو گیا تھا گھر کا ماحول جو ایسا تھا ابا ہمارے پکے مسلم لیگی بھیا ہمارے مسلم لیگ کے سب سے بڑے جیالے اور چھوٹے بھیا......
اور ہر بار کی طرح اس بار بھی دادی کی آنکھیں بھیگی تھیں' دوپٹے کا پلو آنکھوں پر الجھ کر لحہ بھر کو سکوت کیا' جل تھل ہوتی آنکھوں کو ڈھارس دی اور دل کو سنبھالا یوں بھی جب سے دادی کی آنکھوں میں موتیا اترا تھا اور ان کا آپریشن ہوا تھا ڈاکٹرز نے انہیں یوں جل تھل ہو کر رونے سے منع کیا تھا کچھ وہ خود بھی اپنی صحت کے بارے میں محتاط تھیں' ایسی بے احتیاطی سے گریز کیا کرتیں۔
"ہاں چھوٹے بھیا! بس بیٹی! یہ قیامت کے منظر مجھے نہ یاد دلایا کرو جب بھی وہ دن یاد آتے ہیں' دل میں برچھیاں سی اتر آتی ہیں' میرے شہزادے بھیا ہائے کیا بانکپن تھا اور کیا مہذب ادب آداب کے سانچے میں ڈھلے فرمانبردار نیک خوش رو جوان تھے چھوٹے بھیا۔"
اب کے انہوں نے واضح طور پر میری طرف دیکھا تھا اور آواز کی لو بھی بڑھائی تھی میں ایسے ہو گیا جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا' یوں بھی میں سن کب رہا تھا اردگرد سے لاتعلق تھا۔
"ابا ہمارے الہ آباد کے جلسے میں گئے تھے وہی یادگار جلسہ۔ جس کا چرچا سارے عالم میں ہوا تھا' وہ دن اماں اور ابا کی خوب لڑائی ہوئی اماں بضد تھیں کہ کوئی ضرورت نہیں ایسے جلسے جلوسوں میں جانے کی خوامخواہ جان کے لالے' خود اپنے دشمن ہوتا ایسے حالات چل رہے ہیں کمبخت خلقت مرنے مارنے کو تلی پھرتی ہے اور انگریز یہ موا' بھرا سانڈ بنا ہوا ہے آزادی کی بات کرو تو جھٹ بندوق ہی نہیں توپ تان لیتا ہے۔ اس کا تو کچھ نہیں جائے گا چھٹانک بھر کا بارود ہی لگے گا ارے ہماری عمروں کی کمائیاں لٹ جائیں گی' بس میں نے کہہ ڈالا نہیں جانا تو نہیں جانا' اپنے دونوں لاڈلے سر چڑھے سپوتوں کو بھی لگام ڈال دیں' ورنہ انہیں بھی باندھ کر گھر بٹھانا آتا ہے مجھے۔" پہلے دن تو اماں کے جلال کا دریا خوب ہی چڑھا تھا' میری گڑیا کا غرارہ سیتے سیتے انہوں نے یہ لمبی چوڑی تقریر جھاڑی تھی اور غصہ ان کے سرخ پڑتے گندمی چہرے سے چھلک چھلک جا رہا تھا' ابا یوں فرمانبرداری سے اخبار گود میں تہہ لگائے بیٹھے تھے' جیسے سچ مچ اماں کے غصے سے خوف زدہ ہو کر نہ جانے کا ارادہ کر بیٹھے ہیں۔ اس دن گڑ کے چاول بنے تھے جب ابا نے کھانے کے بعد اماں کے ہاتھ کے ذائقے ان کی محنت کی خوب ہی تعریف کی تھی' اماں تو شرمائی جا رہی تھیں۔"
"توبہ دادی! آپ تھکتی نہیں یہ ہزار ہا بار کی دہرائی ہوئی فضول قصہ کہانی بیان کرتے۔" مجھ سے اب اور برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا' سو اٹھ کر ضبط کرتے کرتے بھی بول گیا۔
آپی کی آنکھوں میں جو غصہ' سرزنش تھی سو تھی دادی کا ردعمل اس بار بالکل مختلف تھا' اکثر اس طرح ان کی دس ہزار بار کی دہرائی ہوئی کہانی کے دوران ہی میرا پیمانہ صبر لبریز ہو جایا کرتا تھا اور دادی اس کے بعد

خوب مجھے لعن طعن کرتیں، "نئے زمانے نئی تہذیب کو کوستیں زمانے بھر کی ایجادات کو موردِ الزام ٹھہراتیں، نئی پود کی سرکشی بے ادبی اور گستاخ طبیعتوں پر لعنت بھیجتیں مگر آج انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا چپ ہو گئیں۔ نظریں اٹھا کر اپنی بھیگی سرمئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"بند ہو جائیں گی بیٹا یہ قصے کہانیاں بھی آخری پیڑھی چل رہی ہے ہم جیسے قصہ گو لوگوں کی، پھر ڈھونڈو گے زمانے بھر میں کوئی ان وقتوں کی ذرا سی کوئی بات سنا دے، اس زخم زخم داستان کا کوئی حرف مکرر ہی دہرا دے جب بھی یہ دن آئیں گے اگست کی گھٹن بھری باتیں برسیں گی، ہزار بار کی دہرائی ہوئی کہانی اصل ہے نہ سنو گے نہ یاد رکھو گے تو اپنے اصل کی تلاش میں دنیا بھر میں خوار ہو گے اور دنیا تمہیں خوار کرے گی جنہوں نے اس ایک ٹکڑے کے حصول کے لیے اپنا خون یوں بہایا جیسے لوگ پانی بہاتے ہیں اور آج تم لوگوں کو وہ خون پانی ہی تو لگتا ہے اس بے قدر نہیں ذرا اس ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر اپنے بازو پر ایک انچ بھر کی کھرونچ ہی کاٹ کر دیکھو، کیسا درد کا بھالا دل میں اترے گا ہمیں دیکھو، ارے احسان فراموش نسلو ہم نے اپنے بھائی اپنے باپ اپنی مائیں بہنیں کٹوا ڈالی تھیں اور آج ___ آج یہ صلہ ہے ہماری ان قربانیوں کا کہ تم احسان فراموش تو بن ہی چکے ہماری اس لہو لہو داستان کو سنتے بھی تمہارے کان دکھتے ہیں۔ دیکھنا کیسے ایک بازو کٹ گیا مشرقی پاکستان ہماری قومی تاریخ کا رستا زخم جو کبھی نہیں بھر سکتا پھر تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس نام کا کوئی بازو ہمارا تھا بھی یا نہیں۔"

دادی ڈاکٹر کی ہدایت اور اپنی محتاط طبیعت کی پروا کیے بغیر پھپھک پھپھک ___ کر رونے لگیں ان کا سانس ان کے کمزور سینے میں زور زور سے چلنے لگا۔

"میرے بچے اپنی خودی کو یاد رکھنا ___ ورنہ یہ زمانہ ایک پل نہیں لگائے گا تمہیں مٹانے میں ___ اور بھول رہے ہو نا خود کو اپنی ذات کو اپنی پہچان کو ___ اسی لیے مٹتے جا رہے ہو" دادی کی آنکھیں بند ہو گئیں ان پر غشی سی طاری ہونے لگی۔

"دادی دادی ___ اٹھیں نا دادی ہوش کریں۔" سیما آپی دیوانوں کی طرح انہیں جھنجوڑتے ہوئے اٹھانے لگیں دادی بے جان سی ہو کر ان کی بانہوں میں جھول گئیں۔

"ہونہہ نیا ڈرامہ۔" میں بے زار سا ہو کر باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆
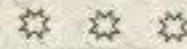
سفید براق یونیفارم میں پنک کاٹن کی چادر لیے بلیک جارز پیروں میں پہنے نازک کلائی پر بندھی گھڑی پر نظریں ڈالتی میری توقع کے عین مطابق وہ چھٹی کے فوراً بعد باہر نکل آئی تھی۔

دور سے بھی اس کا چمکتا چہرہ اس گلابی دوپٹے کے ہالے میں کھلے گلاب کی طرح لگ رہا تھا اس کی چھوٹی ناک جو مجھے زہر لگتی تھی دور سے وہ بھی قابل قبول لگ رہی تھی۔

"کس قدر واہیات لڑکی ہے خود کو قلوپطرہ سمجھتی ہے مجھے جو ذرا اچھی لگنے لگی تو خود کو صوفیہ لورین سمجھنے لگیں محترمہ سارا غرور طنطنہ نہ نکال دیا تو ہادی نام نہیں میرا" میں سیٹ پر بیٹھا خوامخواہ پیچ و تاب کھانے لگا۔

وہی لاشعوری حرکت مجھ سے سرزد ہو گئی جو اس کا خیال آتے ہی ہو جایا کرتی تھی۔

میں تیزی سے اس کا سیل نمبر جو میرے سیل میں فیڈ تھا، پش کر بیٹھا اور اس نے بھی وہی کیا جو ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ سیل بجتے پر فوراً ہی آف کر دیا۔

بے عزتی کا گہرا احساس مجھے اندر تک جھلسا گیا۔

"تمہاری یہ جھوٹی انا اور یہ دکھاوے کا غرور تباہ کر ڈالے گا دیکھنا تم ___ ایسی معمولی صورت پر ایسا غرور ہونہہ۔" میں بل کھا رہا تھا اور وہ آگے بڑھ کر کسی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔

"نکلی نہیں ابھی تک تمہاری وہ مغرور محبوبہ۔" عامر کے منہ سے نکلی فحش گالی مجھے کرنٹ کی طرح لگی تھی۔

"وہ جو سلور مہران میں بیٹھ رہی ہے وہی ہے۔" میں نے ایک لمحہ فقط ایک لمحہ سوچنے کے لیے لگایا اور کہہ ڈالا اگرچہ میں جانتا تھا یہ جملہ یہ پہچان کا ایک جملہ اس کی پوری زندگی کو ایک گالی بنا جائے گا پر مجھے کیا ___ جب خود اسے ہی اپنی زندگی کی پروا نہیں۔

"اور زندگی جیسی فضول چیز کی پروا کرنی بھی نہیں چاہیے" یہ ہم چاروں دوستوں کا اپنا قول تھا اسی لیے تو ہر قسم کے ایڈونچر میں کودنے کا فیصلہ کرنے میں ہم ایک منٹ کی تاخیر بھی نہیں کرتے تھے۔

ون ویلنگ ہم چاروں کا پسندیدہ مشغلہ تھا ___ تھا اس لیے کہ اب نہیں ہے کیونکہ ہمیں اپنا ہی قول ہارنا پڑا تھا اس سے نفرت کرنا پڑی تھی۔ زندگی بہرحال اتنی بھی فضول نہیں جتنی کہ ہم سمجھتے تھے وہ پٹھانوں جیسا حسن رکھنے والا گھبرو جیلا شہروز ہمارا شہسوار ___ ون ویلنگ کا ماسٹر ___ اس بھیگتی بارش میں ہم سب سے آگے پوری بائیک کو ایک پہیے پر اٹھائے ہاتھ چھوڑے فضا میں بار بار بلند کرتے ___ "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے کہ ہمارا یوم آزادی کو سیلیبریٹ کرنے کا یہی انداز تھا۔

ہر سال ہم اسی طرح یوم آزادی کی خوشی بائیک کے ایک پہیے پر کھڑے ہو کر ہاتھ لہرا لہرا کر نعرے لگاتے منایا کرتے تھے کہ چار سال کی وہ ___ وہ خوف ناک دہلا دینے والی یوم آزادی ___ جب ہمارا شیر ہمارا ٹائیگر گبھرو جوان ___ اس کے سر کا پچھلا حصہ آج بھی مجھے یاد آتا ہے تو میرے پورے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جھرجھری ایسی آتی ہے کہ ملک الموت روح کو ساتھ لے کر ہی جائے گی جیسے اس سرمئی بھیگی شام کے وہ وحشت ناک پل ___ سڑکیں ہم جیسے جوشیلے نوجوانوں کی سائیلنسر نکلی بائیکس' ان کے کریہہ ہارنز کی آوازوں سیٹیوں نعروں اور شور اور چیخوں سے کسی بھی شریف آدمی کے چلنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ فیملیز اور بچوں کو لادے بائیک اور گاڑیوں والے ہمارا جلوس دیکھتے کئی فٹ پرے ہی کھسکتے اور موڑ پر ٹرن کاٹ جاتے۔

شیر جوان شہرو نے ___ ون ویل کو الف سیدھا کھڑا کیے وہ جوش اور جذبے سے ہاتھ اٹھائے چیخ چیخ کر نعرے لگا رہا تھا جب اس کی بائیک بے قابو ہو کر دور تک اس گیلی بھیگتی سڑک پر پھسلتی چلی گئی اور اس کے آگے اور پیچھے کتنی ہی بائیکس ایک دوسرے سے ٹکرائیں آگ کے شرارے اڑاتیں شہروز کے ساتھ چار اور لڑکوں کو خون میں نہلا گئیں۔

شہروز کا خوب صورت تنومند جوان بدن ___ کیسا لخت لخت ہوا تھا کہ .....

میں اور رضوان بھی زخمی ہوئے تھے مگر معمولی سے جبکہ عامر اور فہد کو ذرا گہری چوٹیں آئی تھیں۔ مگر وہ گہری چوٹیں بھی چند دنوں میں بھر گئیں۔

اور جو زخم شہروز کی اس خوف ناک، عبرت ناک موت کا ہم سب کے دلوں پر لگا تھا' وہ ان دو سالوں میں بھی نہیں بھر سکا تھا اور بھرتا بھی کیسے اس کی ماں بہنوں کے بین اس کے والد کے واویلے ہم کتنی راتیں سلیپنگ پلز لے کر سوتے رہے۔

وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا' چار بہنوں کا اکیلا بھائی ان بہنوں کو رخصت کرنے والا اکیلا بھائی اپنے بوڑھے ہوتے باپ کا اکیلا جوان سہارا ___ وہ کیسے نہ اس متاع کے لٹ جانے پر بین کرتے ___ اور بین بھی ایسے کہ پتھر کے سینے شق ہو جائیں۔

اور اس دن ہمیں پتا چلا کہ زندگی بہرحال اتنی بھی فضول نہیں وہ جاتے جاتے ہمیں اس گھٹیا ایڈونچر سے ہمیشہ کے لیے بدظن کر گیا ___ ہم میں سے کوئی بھی ایسی دلخراش موت جو جیتے جاگتے زندگی سے دھڑکتے پورے حسین جوان بدن کو لاش میں بدل ڈالے ایسے ایڈونچر سے ہم نے توبہ کر لی۔

"توبہ ___ ایک زندگی کی قربانی کے عوض کی گئی توبہ اتنی مہنگی تو نہ تھی۔"

"اُفوہ اب کون سے مراقبے میں چلے گئے ہو۔" فہد کی جھنجلائی ہوئی آواز پر میں نے اشارے سے رش میں سے رینگ رینگ کر نکلتی سلور مہران کو دیکھ کر سر

بلا دیا۔

"اوکے استاد! سمجھ تیرا کام ہو گیا کل رات فقیروں کے ڈیرے پر پہنچ جانا تازہ گھولی ہوئی بھنگ چرس کے سوٹے اور تیری مغرور محبوبہ قدموں میں سب کچھ ملے گا' وہ بھی ایک اشارے پر ڈن!" یہ عامر تھا اور جسے وہ فقیروں کا ڈیرہ کہہ رہا تھا' وہ اس کے صنعت کار باپ کا زرعی فارم تھا کئی ایکڑوں پر پھیلا ہوا' جہاں مہینے کے دو ویک اینڈ ہمارے فل مستی پروگرام کے تحت گزرا کرتے تھے' میوزک' شراب کباب اور حسن کی فراوانی کیا نہیں ہوتا تھا فقیروں کے ڈیرے پر میں سب جانتا تھا اور آج... آج جب میں اس خود پسند لڑکی کو اپنے قدموں پر گرے روتے گڑگڑاتے منت سماجت کرتے دیکھنا چاہتا تھا تو نہ جانے کیوں میں کترانے لگا۔

"نہیں یار! ابھی تو..." میں انکار کرنا چاہتا تھا جسے سن کر وہ یقیناً" چراغ پا ہو جاتا تھا کام بھی میرا تھا اور دامن بھی میں ہی بچانا چاہ رہا تھا۔

یقیناً" مجھے وہ اس طرح ڈبل کراس نہیں کرنے دیں گے میں جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ کر گیا۔

بس وہی ایک لمحہ تھا چپ کا... اس کے بعد تو اندر باہر شور ہی شور تھا ہنگامہ وہ قیامت کا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور اسی حواس باختگی میں میں دوبار گاڑی مارنے لگا جس پر فہد نے مجھ سے اسٹیرنگ لے ہی لیا۔

"یار! تو اپنے حواسوں میں نہیں ہے چل تو پیچھے چل کر اپنی محبوبہ کی تصویر بنا اور کل رات کے بارے میں سوچ کر مدہوش ہو جا تا ایسے یار تو کسی کے نہ ہوں گے ایک اشارے پر محبوب قدموں میں نہ کوئی عمل نہ وظیفہ نہ عامل کیوں یار!" عامر نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا اور میں مسکرا دیا۔

یہ ٹھیک تھا مجھے ان سے محبت تھی ایسی محبت جیسی پُرخلوص دوستوں کو دوستوں سے ہوتی ہے ایسی محبت جو پیار کرنے والے یاروں سے ہوتی ہے اور ہماری دوستی کو تو سات سال ہونے کو آئے تھے اور ان سات سالوں میں ہم نے کبھی ایک دوسرے سے جدا ہونے کا نہ سوچا تھا اگرچہ کچھ نازک مقامات پر آکر ان کی اور میری سوچ کے انداز میں نمایاں فرق آجاتا تھا اور یہ فرق... صرف ان کی اور میری تربیت کے فرق کی وجہ سے بیچ میں آجاتا تھا کہ دادی... ہاں دادی' مجھے دوستوں سے ایک دن جدا کر دینے والی... اور جب بھی میں اپنے دوستوں سے بچھڑوں گا اس کا سبب دادی ہوں گی' دقیانوسی خیالات اور بوسیدہ سوچ والی دادی نے میری تربیت میں بھی ایسے رخنے اور دراڑیں چھوڑ دی تھیں' جو اکثر ان کی کمپنی میں بھی ابھر کر نمایاں ہو جاتی تھیں اور میرے ہاتھ شرمندگی اور خجالت کے کچھ بھی نہ آتا۔

عامر کا باپ بہت بڑا صنعت کار تھا' تین فیکٹریاں اور ایک مل کا مالک رضوان کا باپ ایم پی اے تھا اور زمین دار پورے پانچ دیہاتوں کا مالک دولت اس کے گھر کی باندی تھی اور فہد کا باپ گریڈ بائیس کا ایک رشوت خور افسر تھا' ان کی شہر میں دو کوٹھیاں اور تین پلازے تھے ان کا جو کرایہ آتا تھا وہ اس کے باپ کی اوپر کی آمدنی کا محض احصہ شمار ہوتا تھا۔ ایسے دیالو اور دلدار والے دوستوں کی کمپنی میں کون بھلا ناخوش رہ سکتا ہے۔

لیکن میرے پاس ناخوش ہونے کی اپنی کچھ خاص قسم کی وجوہات تھیں' جو میری پیدائش کے وقت سے میرے ساتھ جڑی تھیں۔

میرا باپ میرا دادا لوہار تھا لوہا کوٹنے والے... اگر صرف یہی طعنہ میرے نسب کے ساتھ ہوتا تو بھی گزارے لائق تھا میرے باپ دادا ابا کے ایمان دار صابر اور میرا نظر میں کمزور بصارت کے مالک تھے چلو دادا تک تو کمزور بصارت کوئی معنی نہ رکھتی تھی' اس زمانے میں ایسی کمزور بصارت بڑی خوبی شمار ہوتی تھی لیکن ابا کے سامنے تو یہ دولت کی چکاچوند بکھری تھی کہ اندھے کو بھی ہر طرف سے چھلکتی دولت اور اس کے ہوشربا نظارے بینا ہونے پر مجبور کر دیتے مگر ابا نے اندھا پن اپنی قسمت کے ساتھ نتھی کر دیا۔

بھائی گیٹ کی انٹرس کے ساتھ ہی ان کی لوہے کی پیٹیاں' ٹرنک اور چاول گندم رکھنے کے بھڑولے بنانے کی دکان تھی اور دکان کے پیچھے کھلے احاطے میں لوہے کو ڈھالنے کی بھی اور تھوڑی دور ہمارا آبائی موٹی موٹی اینٹوں اور کہنہ سال بھدی لکڑی کے دروازوں والا گھر تھا جس سے ہوش سنبھالتے ہی مجھے نفرت سی محسوس ہونے لگی تھی۔

اور کیوں نہ ہوتی اپنے دوستوں میں ایک میں ہی تو دکان دار کا بیٹا تھا' اور جس کے نصیب کا لکھا ان سب کو صاف نظر آ رہا تھا مستقبل کا دکان دار... رضوان تو اکثر مجھے چھیڑتا اور میں تائید تردید کیے بغیر سر ادھر ادھر مارتا خجل سا ہوتا رہتا' پر دادی اور ابا کا اپنا ہی فلسفۂ حیات تھا' جس نے میرے اندر پڑی ان دراڑوں اور رخنوں کو اور بھی پاٹ دار کر دیا تھا۔

اگلا دن میرے لیے بہت مشکل تھا۔

کئی بار جی میں آیا کہ فون کر کے عامر کو منع کر دوں ابھی چند دن رہنے دو تھوڑا ٹائم اور اسے دے کر دیکھتے ہیں کچھ مہلت اور دیتے ہیں... مگر نہ جانے کیوں مجھے میری ساری ہمت کہیں سے دم سی ہو کر رہ گئی

مجھے ابا نے کسی کام سے بھیج دیا تھا اور پیغام جو میرے ذہن میں تھا کہ میں فون کر کے انہیں فی الحال منع کر دوں گا وہ میرے دماغ سے نکل ہی گیا۔

سہ پہر میں جب دوبارہ یاد آیا تو ان تینوں کے نمبر ملا ملا کر میری انگلیاں گھس گئیں مگر ان تینوں میں سے کسی سے بھی رابطہ نہیں ہو سکا' ان کے گھر فون کیا تو پتا چلا تینوں ہی شہر سے باہر گئے ہیں۔

میں سمجھ گیا وہ تینوں کہاں گئے ہوں گے۔ میں خود وہاں جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔

تیار ہو کر باہر جا ہی رہا تھا کہ سیما آپی آگئیں۔ کچھ پریشان کچھ حواس باختہ سی' پہلے تو سوچا نظرانداز کر کے نکل جاؤں مگر پھر نہ جانے کیوں رک گیا۔ وہیں لاؤنج میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

دادی مغرب سے عشاء تک نہ جانے کون سا وظیفہ کرتی تھیں اردگرد سے بے خبر سجدے میں پڑی تھیں اور آپی بے چین سی کچھ مضطرب میرے سامنے بیٹھی تھیں اور میں یونہی چینل چھو کر الف پر آتے زرافوں کی ڈاکومنٹری بغیر دلچسپی کے دیکھے جا رہا تھا۔

"تم کہیں باہر جا رہے ہو۔" انہوں نے ذرا دیر بعد خود ہی پوچھا میں نے جواب دیے بغیر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"کب آؤ گے؟" وہ بے دھیان سی تھیں۔

"دیکھیں۔" میں نے بھی مبہم سا جواب دیا۔

تھوڑی دیر اس بے چین سی خاموشی میں گزر گئی' دادی نے سلام پھیرا تو آپی ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میرے سیل فون پر عامر کی مسڈ کالز آ رہی تھیں' گویا وہ مجھے بلا رہا تھا۔

میں ان دونوں کو ابھی آتا ہوں کہہ کر باہر نکل آیا۔

"آجاؤ جلدی سے ورنہ ہم بے صبری میں تمہارا انتظار نہیں کریں گے صرف آج رات کے لیے بلکہ صبح ہونے سے پہلے ہم اسے فارغ کر آئیں گے' پاپا کے گیسٹ آرہے ہیں کل صبح' آجاؤ بس۔" اس نے جلدی جلدی عجلت بھرے انداز میں کہا اور میرا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

اور جانے کیوں میں سڑکوں پہ گاڑی آدھی رات تک دوڑاتا رہا ان کی پانچ مسڈ کالز کو ان سنی کر کے بے دھیان سا پھرتا رہا اور تھک کر گھر واپس آگیا۔

نہ جانے اندر کیسی گھنٹی تھی' جو بجے جا رہی تھی اور ایک ہی بات کہے جا رہی تھی۔ "یہ غلط ہے"۔

کیا غلط تھا مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"اپنی خود داری' عزت نفس اور اپنے پندار کی حفاظت کرنا ایسا بڑا جرم تو نہیں کہ اس کی اتنی گھٹیا اتنی ظالمانہ سزا دی جائے۔ اس نے فقط تمہیں نظرانداز ہی تو کیا تھا جیسے جیسے تم آج تک بے شمار لڑکیوں کو تھوڑی لفٹ کرانے کے بعد جان بوجھ کر نا صرف نظرانداز کرتے رہے ان میں سے تو کسی نے تمہارے ساتھ بدلے کے طور پر ایسا نہیں کیا تو تم کیوں اتنا گر گئے کہ

رات گزرتی جا رہی تھی سائیں سائیں کرتی، بے سکون سی رات سیاہیوں میں سیاہی گھولتی میرا سکون میرا قرار میری نیند بھی اپنے دامن میں سمیٹے قطرہ قطرہ گھٹ رہی تھی۔

کیسی حبس بھری رات تھی، وہ حالانکہ اس موسم میں تو حبس نہیں ہوتا اوائل اکتوبر میں تو راتیں ایسی خوشگوار ہوتی ہیں کہ نیند تو کسی بدمست جھونکے کی طرح اڑائے ہی لے جاتی ہے تو پھر یہ کیسی رات تھی۔

رات کے گہرے سناٹے میں فون کی بیل بجی تھی میرا دل جیسے کسی گہرے کنوئیں میں اتر گیا۔

صبح دم دور کہیں فضاؤں میں کسی مؤذن کی میٹھی آواز گونجی تھی اور جیسے میری روح کو اذن رہائی مل گیا۔

میں گہری نیند سو رہا تھا، جب باہر سے گزرتے مسلسل قدموں کی چاپ سے میری آنکھ کھل گئی۔

دن کے بارہ بج رہے تھے گویا میں پانچ چھ گھنٹے سویا تھا۔ سستی سے اٹھ بیٹھا۔

"غضب خدا کا دیکھو تو سہی انسان نہ ہو گئے درندے ہو گئے، اب تو ایسے خونخوار ظالم درندے بھی نہیں ہوتے اور ہوں گے بھی کیوں جب انسانوں نے ان کی جگہ سنبھال لی تو وہ بے چارے کہاں رہیں گے، قیامت ہے، میرے اللہ!" دادی کی ہول ہول کر نکلتی آواز پر میں نہ جانے کیوں ایکدم سے اٹھ بیٹھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، دادی کس کو کہہ رہی ہیں، ویسے تو اس طرح کے الفاظ وہ دن میں اکثر ہی استعمال کر لیا کرتی تھیں، جب بھی قتل و غارت گری کی خبریں سنتیں تو خود ہی سینے پر ہاتھ مار مار کر بولتی رہتیں مگر اس طرح تو نہیں۔

میں بے چاپ قدموں سے اٹھا اور دروازے سے جھانکنے لگا، دادی کے سامنے سیما آپی اور ابا بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکا مگر میرے اندر عجیب سی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تھی میں وہیں کھڑا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

ہم اکٹھے بیٹھے کافی پی رہے تھے گرم گرم بھاپ اڑاتی کریم کافی میری پسندیدہ تھی اور صبح سے یہ میرا پانچواں مگ تھا۔

اسی وقت دروازے پہ دستک ہوئی۔

موسم کی پہلی برف باری پیش گوئی کے عین مطابق دن بھر جاری رہی تھی اور ابھی بھی باہر اسی طرح بلکہ پہلے سے زیادہ رفتار کے ساتھ برفیلی تند ہواؤں کے ساتھ برف کے گالے اڑتے پھر رہے تھے سڑکیں مکانات ڈھلوانیں ہوٹلز کی چھتیں دکانیں سب کے اوپر برف کی پتلی سی تہہ جمنا شروع ہو چکی تھی۔

"اس وقت کون آ گیا۔" عامر نے مخمور آواز میں کہا میرا کریم کافی کا پانچواں مگ تھا تو اس کا اسکاچ کا شاید چھٹا ساتواں جام۔۔۔ اس معاملے میں وہ گنتی کا قائل نہیں تھا۔ اس کی پراڈو کی ڈگی میں دو کریٹ تھے اس کے اس پسندیدہ مشروب کے۔

اور میں۔۔۔ میں اس دوڑ میں بھی پیچھے رہ گیا تھا، معدے کے السر نے مجھے اس لت سے بھی دور رہنے پہ مجبور کر دیا تھا کہا تا میری ذات میں کچھ رخنے اور دراڑیں ایسی رہ گئی تھیں، جو مجھے اپنے دوستوں جیسا بننے نہیں دیتی تھیں۔

"سنگین خان ہو گا اس وقت وہی آ سکتا ہے۔" حمد کا حال عامر سے بھی بدتر تھا۔

روما نے غصے سے ایک نفرت بھری نگاہ ان تینوں پر ڈالی۔

"او ہو زبردست، بس آ جاؤ۔" رضوان ایکدم سے کھل اٹھا تھا اور توقع کے عین مطابق دروازے پہ سنگین خان ہی تھا اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی تھی۔

"رات کو بلاوا بھیجو گے تو آ جاؤں گی، وہ ہمارا رات کا دھندا ہے۔" مجھے لگا اس نے اندر داخل ہوتے ہی ہاتھ میں پکڑا ہوا نوکیلا پتھر مجھے کھینچ کر مارا ہو۔

میرے منہ میں جیسے زہر گھل گیا، کافی کا گھونٹ ایکدم کڑوا کسیلا ہو گیا۔

میں نے بے اختیار مگ سامنے پڑے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"او۔۔۔ او سنگین خاناں، بڑے وقت پہ آئے۔" عامر

کی بھاری مخمور آواز میں کچھ اور بھی نشیلا پن اتر آیا۔

"صاب لانے کو تو میں اسے لے آیا ہوں پر آج کی رات اگر آپ معذرت قبول کر لیتے۔۔۔ تو اچھا تھا ہمارا مطلب ہے اس کی ماں کا طبیعت اچھا نہیں' جاڑے کی پہلی برف ہے تو اس کا یونہی حالت خراب ہو جاتا ہے' دو ایک دنوں میں لے آوں گا۔" سنگین خان اسے اپنی آڑ میں کرتا ہوا لجاجت بھرے انداز میں بولا۔

"ماں کا حال خراب ہے تو اسے تو اور بھی پیسوں کی ضرورت ہو گی پھر۔" رضوان چمکتی نگاہوں سے اس پہاڑی سیب کو تکتے ہوئے بولا۔

"وہ تو ہے صاب! اس لیے تو آیا ہے اگر آج آپ سے ہی۔۔۔ بھلا ہو گا نیکی کا کام ہے۔" وہ منت بھرے لہجے میں بولا تو ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"بھلا کرنے ہی تو بیٹھے ہیں ادھر سنگین خاناں اور نوٹ کوئی درختوں پر تو اگتے نہیں کہ یونہی لٹاتے پھریں آگے تمہاری مرضی۔" مجھے پتہ تھا' وہ تینوں اس معاملے میں کتنے خبیث ہیں ایک روپے کی رعایت نہیں کریں گے۔

بس یہی وہ سب سے بڑی دراڑ تھی ہم چاروں کے بیچ' جہاں آ کر میرا رستہ خود بخود ان تینوں سے جدا ہونے لگتا تھا۔

"صاب مہربانی ہو گا کل آجائے گا ام۔" سنگین خان کی ناکامی پر وہ خود ہمت کر کے آگے بڑھی۔

اس کے چھریرے بدن پر ابھی بھی صبح والا سیاہ جھالروالا فراک تھا جس پر رنگ برنگے موتی اور گھونگھے لگے تھے کل جب وہ پہلی بار اس کمرے میں آئی تھی تو میں دروازہ کھولنے گیا تھا اور وہ میرے پاس سے گزری تھی۔

اس کے لباس سے کسی کھٹے دودھ اور مکھن کی باس ابھری تھی کہ میرا دل خراب سا ہو گیا معلوم نہیں کب سے اس نے یہ لباس پہن رکھا تھا۔

ان لوگوں کی صاف ستھری دودھیا رنگت صفائی ستھرائی کے سارے عیب چھپا لیتی ہے اور مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا وہ سنگین خان کے ساتھ کیوں آئی ہے۔

اور جب مجھے پتا چلا۔۔۔ عامر اور رضوان نے برف سوڈا اور اسکاچ کی بوتلیں میز پر سجا ئیں جس کے فقط تین گھونٹوں نے ہی میرے السر کو دہکا دیا۔

میں الٹی کرنے کے بہانے باہر نکلا اور پھر اندر نہ جا سکا۔

"کل کی بات کل کے ساتھ۔۔۔ سنگین خاناں شگریف نہ سہی اور کوئی ہیرا نہیں تمہاری گدڑی میں۔" فہد کمینگی سے بولا۔

"کیوں نہیں صاب ابھی لاتا ہوں آپ حکم کریں۔" وہ اپنے مکروہ دانت نکوستے ہوئے بولا۔

شگریف کے چہرے کا رنگ ایک دم سے پیلی سرسوں سا ہو گیا' اس نے باری باری اپنے سپلائر اور اپنے کلائنٹس کی طرف دیکھا۔

"نہیں صاب۔۔۔ کوئی اور کیوں' ام کس لیے ہے آپ حکم بولو۔۔۔ ماں بھلا چنگا ہو جائے گا' چند گھنٹوں کی تو بات ہے ام حاضر ہے آپ۔۔۔" وہ لجاجت سے کہتے ہوئے آگے بڑھی۔

میں اور روما ایک ساتھ اٹھے تھے' ان تینوں نے ہماری طرف دیکھا' ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکل آئے تھے اور پیچھے سنگین خان نے باہر نکل کر پیچھے سے دروازہ بند کر دیا۔

"ان تینوں نے میرے ساتھ دغا کیا ہے دھوکے باز باسٹرڈ!" ہم دونوں بغیر کسی ارادے کے باہر نکل آئے تھے۔

گرم کپڑے تو ہم نے کافی پہن رکھے تھے مگر باہر ٹھنڈ بھی بلا کی تھی۔ روما اس غضب ناک سردی سے بے نیاز کسی گیلی لکڑی کی طرح سلگ کر بولی تھی اور میں اس سے یہ بھی نہ کہہ سکا تم کیوں ان دھوکے بازوں کے ساتھ چمٹی ہوئی ہو' جواب میں وہ یہی سوال مجھ سے کر لیتی تو۔۔۔ تو اس سوال سے جواب تک ایک کٹھن مرحلہ بیچ میں آتا تھا میں اس کٹھن مرحلے سے کیسے گزر سکتا تھا۔

"ایک ہفتے کے انہوں نے مجھ سے سیونٹی تھاوزنڈ طے کیے تھے اور اب بیچ میں یہ مکار سنگین خان اس اسٹوپڈ گھٹیا پہاڑی طوائف شگریف کو لے آیا اور ان مکار لوگوں کو اپنی جھوٹی مجبوریوں کو خوب بنا سجا کر ہمدردی اور روپے بٹورنا آتے۔"

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے مسلسل سلگے جا رہی تھی ہم دونوں دور تک ویران یخ بستہ مال روڈ پر بے مقصد چل رہے تھے اوپر کی طرف جاتی ہوئی چڑھائی کی طرف برف باری رک چکی تھی اب صرف چپ چپ سی مدھم مگر یخ ہوا چل رہی تھی۔ ہم دونوں کے منہ اور ناک سے دھوئیں کے مرغولے نکل رہے تھے۔

"مجبور تو سب ہوتے ہیں اور اپنی اپنی مجبوری کو پیش کرنے کا ڈھنگ بھی علیحدہ ہوتا ہے۔" اب اس کی تسلی کے لیے مجھے کچھ تو کہنا تھا۔

"لاسٹ ٹائم بھی ان تینوں نے میرے ساتھ یہی کیا تھا' پچاس ہزار طے کر کے فقط تیس ہزار میں ٹرخا دیا تھا۔"

"تو تمہیں اس بار ان کے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" اس بے مقصد چڑھائی سے میرا سانس پھولنے لگا تھا اور سردی سے جیسے سارا چہرہ ہی اکڑ گیا تھا' میں نے واپسی کے لیے رخ پھیرا۔

"تو کیا کروں میں بھی تو مجبور ہوں ضرورت مند۔۔۔ یہ تینوں بہرحال فراڈ تو نہیں کرتے۔" وہ کہتے کہتے ایک دم تھک کر فٹ پاتھ کے ساتھ بنی ریلنگ کے سہارے ٹک گئی۔

"تھک گئی ہوں اب۔۔۔" وہ سر پر گرم ٹوپی کو جماتے ہوئے تھکن زدہ لہجے میں بولی میں ریلنگ سے ٹک کر نیچے دور ڈھلوانوں میں کہیں کہیں رنگین ستاروں کی طرح ٹمٹماتی بڑا دلفریب نظارہ پیش کرتی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

"تو کیوں کرتی ہو ایسا کوئی جاب کر لو۔" میں بہت دیر بعد بولا تھا کہ وہ اپنا سوال بھی بھول چکی تھی گردن موڑ کر مجھے دیکھنے لگی اور پھر اٹھ کر میرے برابر کھڑی ہو کر نیچے اس دلنشین نظارے کو تکنے لگی۔

"تمہیں مل گئی جاب میں تو پھر جسٹ سیکنڈری ہوں گریجویٹ مکمل بھی کر لیتی تو بھی مجھے یہی کرنا تھا ہمارا خاندانی پیشہ۔۔۔ ماما نانو وہ مشہور زمانہ کوٹھا تو چھوڑ آئیں مگر اپنے لہو میں رچے اس دھندے سے پیچھا نہ چھڑا سکیں اور میں جو جوان ہونے سے قبل اس پیشے سے اتنی گھن کھاتی تھی اور دل میں شریفانہ زندگی گزارنے کے سو سو ارادے بندھا کرتی تھی' ذرا سی تنگ دستی آئی پھر ماما کی بیماری۔۔۔ ماما کی بیماری سمجھو یا اچھی زندگی کے حصول کا شارٹ کٹ۔۔۔ مجھے اپنا فیملی پروفیشن جوائن کرنا ہی پڑا اور کیا کرتی۔۔۔ بس اب بھی کبھی کبھی دل میں اس پاکیزہ زندگی کی تڑپ کروٹ تو لیتی ہے مگر مجھے پتہ ہے اب یہ ممکن نہیں۔" وہ اب سگریٹ سلگا کر بڑے مزے سے کش لے رہی تھی۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی اس نے لمبا سانس لے کر سگریٹ کی ڈبی میری طرف بڑھائی میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تم تو ان جیسے نہیں پھر ان کے ساتھ کیوں ہو تمہیں کون سی مجبوری ہے ان کے ساتھ چپکنے کی؟" اس نے وہ بات کہہ ڈالی جو میں خود سے کہتے ڈر رہا تھا۔

میں کمپلیکسز کا مارا ہوا' بے مقصد زندگی گزارنے والا انسان اکثر جب کبھی قنوطی ہوتا تو آئینہ دیکھنے سے بھی گھبرا جاتا کہ آئینے کا سچ مجھ سے سہا نہیں جاتا تھا۔

سچی بات ہے میں بھی بھاگتے بھاگتے تھک چکا تھا' اب حقائق کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھنا چاہتا تھا۔

"پتا ہے شروع میں جب ابھی میں۔۔۔ خود سے بھی چوری تمہارے ساتھ کے سپنے دیکھتی تھی پھر ان تینوں کی دوستی نے مجھے با آسانی اس دلدل میں اتار دیا اور تمہارے ساتھ کے سچے پاکیزہ سپنے بھی میرے ساتھ اس دلدل میں دفن ہو گئے۔

تم جو ان کے ساتھ بھی رہتے ہو اور ان کے ساتھ سے گریزاں بھی لگتے ہو مجھے قوی امید تھی کہ تم جلد ہی اپنے رستے پر چل پڑو گے مگر۔۔۔ کیا تم فیصلہ نہیں کر پا رہے' ورنہ ایک صاف ستھری اچھی زندگی تمہاری منتظر ہے۔" اس نے بڑی اپنائیت سے میرا کندھا چھو

کر کہا۔

"میں صبح ان تینوں سے دو ٹوک بات کروں گی اگر انہیں اب میری ضرورت نہیں تو میں واپس چلتی ہوں یہاں اتنی شدید سردی میں اپنی ہڈیاں فریز کرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں ان دنوں تو لاہور میں بھی ہمارا خوب سیزن لگتا ہے۔"

"اندر آجاؤ ورنہ یہیں کھڑے کھڑے سنو مین بن جاؤ گے اور یہ تمہاری خوش فہمی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی شاندار گاڑی میں کسی ڈیڈ باڈی کو لاد کر لے جائیں گے بابے۔"

وہ حقیقت کی اس گہرائی تک پہنچ چکی تھی جہاں میں چاہتے ہوئے بھی نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ رومیرے اندر اس کشش کو چھیڑ کر جا چکی تھی جو پہلے دن سے یہاں آنے کے بعد میرے اندر چپ کی بکل اوڑھے خوف زدہ سی چھپی بیٹھی تھی۔

"کیا میرا جرم اتنا بڑا تھا جو مجھے اتنی کڑی سزا ملی ـــــ" وہ تاروں بھرا خوب صورت منظر بہت خوف ناک روپ دھار رہا تھا۔

"میں نے تو مذاق میں ـــــ" وہی بودی دلیل جو گزشتہ پندرہ روز سے میں خود کو دیتا آ رہا تھا دینے کی کوشش کی۔

"مذاق؟ مذاق؟" نیچے پوری وادی اتنی زور سے چیخی تھی کہ میں گھبرا کر پیچھے لڑکھڑا گیا۔

☼ ☼ ☼

"ارے میں بھائی کے سیل سے فون کر رہی ہوں نا میرا سیل گھر پہ ہے تم میرا نمبر نوٹ کر لو ایڈریس تو میں تمہیں لکھوا چکی ہوں جب گھر سے نکلو تو مجھے کال کر لینا گھر کا فون تو خراب ہے آج کل۔"

وہ گاڑی کی بیک سے ٹیک لگائے اتنا اونچا ضرور بول رہی تھی کہ اس گاڑی کے اندر بیٹھ کر مجھے اس کی آواز بخوبی سنائی دے رہی تھی میں تو پارکنگ سے اپنی گاڑی نکالنے کے لیے آیا تھا گاڑی ریورس کرنے لگا تو یہ محترمہ میری گاڑی کی بیک سے ٹیک لگائے محو گفتگو تھیں، سائیڈ مرر میں اس کا سائیڈ پوز اور بیک نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنی دوست کو نمبر نوٹ کروایا اور میں نے شرارت میں یونہی اپنے سیل میں اس کا نمبر فیڈ کر لیا۔

"ابھی جاؤ علیزے دیر ہو گی۔" کسی آواز نے اسے دوسری جانب سے پکارا تھا۔

اس کے بیٹھتے ہی میں نے باقاعدہ گردن نکال کر اسے دیکھا وہ زبردست سراپے کی مالک تھی پتلا دبلا چھریرا بدن اس روز بھی پنک دوپٹے میں چھپا ہوا تھا، پنک شلوار اور نہ معلوم کس رنگ کی قمیص تھی، جوتے البتہ بہت خوب صورت بلیک کلر کے تھے وہ بالکل میرے پاس سے گزری تھی اس کی شہابی رنگت تھی چہرہ بھی اچھا تھا صرف ناک چپٹی سی تھی چینیوں اور تھائی لڑکیوں کی طرح مگر اس کے چہرے پر جچی ہوئی تھی۔

میرا ارادہ اسے فون کرنے کا نہیں تھا۔ اگر وہ دوسری بار مجھے دوسرے ہی دن نظر نہ آ جاتی تو۔ میں سیما آپی کو کالج پک کرنے گیا تھا اور وہ کالج گیٹ سے نکل رہی تھی اور بائے چانس میں نے اسے پہچان بھی لیا سفید یونیفارم میں وہ مجھے پہلے سے کچھ زیادہ اچھی لگی اور اس رات میں نے اسے فون کر لیا۔

تین بار اس نے رانگ نمبر کہہ کر سیل آف کر دیا۔ چوتھی بار میں نے اس کا نام اور کالج کا نام کلاس ایئر کا بتا کر چونکانا چاہا مگر وہ اچھی خاصی چکنا گھڑا ثابت ہوئی۔

"تم مجھے پہلی نظر میں کیسی لگی ہو کہ میرا خود پر سے اختیار اٹھ گیا ہے یو آر مائی ڈریم گرل اور پلیز میں تو تم سے محض دوستی کرنا چاہتا ہوں اس طرح جان چھڑاؤ گی تو میرے اندر کا دیوانہ بھڑک اٹھے گا تھوڑی سی دوستی تھوڑی سی گپ شپ اور جو تھوڑا سا پیار ہو جائے تو کیا برا ہے زندگی اسی جذبے کا تو نام ہے۔"

آگے جو میں نے دو فقرے کہے مجھے خود پر حیرت سی ہوئی کیا میں اتنا بھی بے باک ہو سکتا ہوں۔

اور جواب میں اس نے مجھے جن نفرت بھرے القاب اور گالیوں سے نوازا اس نے تو لمحہ بھر کو میرے چودہ طبق ہی روشن کر دیے شاید جواب میں میں بھی مغلظات کا طوفان بکتا اس کا سیل آف ہو چکا تھا۔

پھر وہ کتنے دن آف ہی رہا۔

مگر میں نے بھی ہمت نہیں ہاری۔

پندرہویں روز اس کے ہیلو کہتے ہی میں پہچان گیا آج میں نے دوسری سم ڈال کر بات کی تھی اس سے۔

"میں تم سے کل شام چھ اور سات بجے کے درمیان "سالٹ اینڈ پیپر" گلبرگ برانچ میں ملنا چاہتا ہوں اگر تم نہ آئیں تو نتائج کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔" میں نے اسے مہلت دیے بغیر ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا پیغام اسے کہہ ڈالا۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تم سے ملنے پر، کسی لڑکی سے بات کرنے کی نہ تمیز ہے نہ آداب نہ جانے تم کس تنگ خاندان سے تعلق رکھتے ہو تمہاری ماں نے تمہیں ـــــ" اس سے آگے جو اس نے کہا میں نے اپنا نمبر آف کر دیا، میرے اندر کا انتقام سو جاگ گیا تھا۔ اس نے شاید بعد میں مجھ پر ہی پھینک دی تھی اب اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا، بلکہ اسے سبق سکھانا چاہتا تھا اپنی جس شرافت حیا اور عزت کے بلند و بانگ دعوے تھے اسے میں ان ہی دعووں کو تار تار کرنا چاہتا تھا۔

اور میں نے وہ کر ڈالا جس کا کرنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔

ان تینوں کو علیزے کی ایک جھلک دکھانے کی دیر تھی دوسری رات وہ اسے اغوا کر کے اپنے فارم پر لے جا چکے تھے یہ الگ بات کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی میرے دل کو سکون ملنے کے بجائے بے سکونی بے قراری اور انوکھی سی آگ لگ گئی تھی۔

اور اسے کیا معلوم اس کی بددعا کیسی تیز اثر نکلی کہ مجھے توبہ کی مہلت بھی نہیں مل سکی۔

"میرے خدا! میں کیا کروں؟" میں بے چین سا ہو کر بیڈ سے اتر آیا کوئی بھی حل مجھے اس عذاب سے نکلنے کا سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"صرف ایک حل یہ ملک چھوڑ جاؤں۔" میرے دماغ کی سوئی پھر وہیں آ کر اٹک گئی۔

دادی اور ابا، سیما آپی آنکھوں میں پانی لیے پھر سے بیچ میں آ گئیں۔

جنہوں نے ایک برداشت والی زندگی کسی اچھے نیک اجر کے انعام کے انتظار میں گزاری اور جب قدرت نے وہ نیک اجر ان کی جھولی میں ڈالا تو میں ان کا خود غرض بھائی اس اجر کو عذاب بنانے پر تل گیا۔

"سیما آپی ـــــ سیما آپی میں کیا کروں؟" بے بسی نے چہار جانب سے مجھے گھیر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے؟
ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

"ہادی، ہادی اٹھ جاؤ اٹھو میرا بچہ میرا شہزادہ شاباش ـــــ اٹھ کے نماز پڑھ لو ٹائم نکلا جا رہا ہے۔"

دادی کے ابا الٰہ آباد کے جلسے سے کیا ہو کر آئے سارے گھر کے لیے اقبال اٹھا لائے کلام اقبال دادی کے گھر میں یوں پڑھا جانے لگا جیسے کوئی مذہبی صحیفہ شکوہ جواب شکوہ تو دادی کو حفظ تھا۔

دادی بہت پڑھی لکھی نہیں تھیں صرف چار جماعتیں پاس تھیں کہ لیل اس بارے میں وہ ہر بار ہنس کر کوئی نہ کوئی اقبال کا شعر پڑھ ڈالتیں۔

عالم کیف ہے، دانائے رموز کم ہے
ہاں! مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے

محض دادی سے ضد میں مجھے اقبال تو کیا شعر و شاعری ہی سے چڑ ہو گئی اور یہ الگ بات کہ سب سے زیادہ اقبال کے اشعار کی تشریح میں ہار کس بھی میرے ہی زیادہ ہوتے تھے دادی نے اقبال کا کلام شاید ہم دونوں بہن بھائی کی گھٹی میں گھول کر پلا دیا تھا کہ ہم اپنا شجرہ تو بھول سکتے تھے اقبال کے اشعار میں غلطی نہیں کر سکتے تھے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے! رہبر و منزل ہی نہیں

ہر کوئی مست مے ذوق تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو! یہ انداز مسلمانی ہے

پڑھتے پڑھتے ٹریک سے دوسری طرف ہو جاتیں میں تمکیں چہرے اور کانوں میں گھسیڑ لیتا۔

خود کشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خود دار
تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار و سراپا، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستان بہ کنار
اب تک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی

ان کی لے ان کی گھن گرج بڑھتی ہی جاتی اور ہمیں ہار مان کر بستر چھوڑنے پڑتے۔ صحیح کہا بڑوں نے بیٹیوں کو پسند کے سانچے میں ڈھالنا بڑا آسان ہوتا ہے۔ سو سیما آپی بڑے آرام سے دادی کے پسندیدہ سانچے میں ڈھل گئیں اور میں ــــ اگر دادی مجھے اس حد تک الف سید حا جیسا مثالی کردار نہ بنانا چاہتیں تو شاید میں کم از کم ابا جیسا سادھو تو بن ہی جاتا مگر دادی کے کڑوے کسیلے طنز بھرے اشعار نے میرے اندر بغاوت بھر دی یونہی خوامخواہ۔

حالانکہ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ بغاوت سرکشی میری فطرت میں تھی ہی نہیں، محض دادی کو تنگ کرنے کے لیے میں نے ہر الٹے پلٹے کام اور مشغلے کو اپنا لیا جس کے نتیجہ میں ایک بھٹکا ہوا بے مقصد پریشان خیال شخص بن کر رہ گیا تھا۔

دادی کے اصرار پر میں شدید سردیوں میں سو سو کر تا رو تا جاتا اور برف جیسے پانی سے وضو کرتا جاتا نماز وہ مجھے پہلے ہی سکھا چکی تھیں۔

"سات سال کی عمر سے شروع کرو گے تو ہڈیوں میں اترے گی۔" وہ نیت باندھنے سے پہلے تک نصیحتیں کرتی رہیں اور میں نے آدھا جاگتے آدھا سوتے اپنی زندگی کی وہ پہلی مکمل نماز پڑھی اور صرف ایک نماز سے ہی چھٹکارا نہیں ہو گیا جیسے ہی مسجد سے اذان کی آواز گونجتی دادی مجھے گھر کے گلی کے ہر کونے سے ڈھونڈ لیتیں۔

اور ان کی کوششوں کا نتیجہ کہ چودہ سال کی عمر تک نماز واقعی میری ہڈیوں میں اتر گئی۔

پھر اگلے چار سال میں فرمانبرداری سے نماز اور شرافت بلکہ نیک ہدایت جس کی دادی ہر گھڑی دعا مانگا کرتی رہتی تھیں کہ تفسیر بنا پھرتا رہا۔

میری ذات میں جنگ خیر اور شر نیکی اور لذت گناہ کی اس روز شروع ہوئی، جب عامر اور فہد، رضوان کی وساطت سے میری زندگی میں آئے۔

پہلے میں نے دن کی نمازیں چھوڑیں جان بوجھ کر ان کی محفل میں بیٹھا اذان کی آواز سن کر سر و اور گھڑی کی گردش کرتی سوئیوں کو دیکھ کر اندھا بن جاتا پھر آہستہ آہستہ دوسری کمزوریوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔

"چھوڑ اس پڑھائی وڑھائی کو آخر تو نے ابا کی ہٹی سنبھالنی ہے لوہے کی بلٹیوں اور ٹرنکوں کا حساب کتاب لگانا ہے اس کے لیے تو کسی ڈگری کسی ایم بی اے کی ضرورت نہیں تو فضول میں بھیجا پلپلا کرنے سے فائدہ۔"

وہ تینوں اس سے پہلے کس طرح بغیر پڑھے ہر جماعت سے اگلی میں پروموٹ ہوتے رہے تھے، مجھے نہیں پتا کہ وہ پڑھتے نہیں تھے۔

رات کو دیر سے آنا اکثر صبح منہ اندھیرے آنا اور دادی کسی بد روح کی طرح تسبیح ہاتھ میں لیے پھر رہی ہوتیں میں لاکھ بچ کر چھپ چھپا کر کمرے تک پہنچنا چاہتا وہ مجھے پکڑ ہی لیتیں۔

پھر جوان کے ــــ نصیحتے شروع ہوتے اور میری آنکھیں نیند سے بند ہوئی جاتیں، دادی کی نصیحتوں میں افسردگی اترنے لگی تھی مسلسل بولنے کے بیچ لمبے لمبے خاموشی کے وقفے آنے لگے تھے پھر ایک رات ــــ

ان تینوں نے بری طرح پی رکھی تھی پی تو میں نے بھی تھی مگر دو چار گھونٹ، ابھی تک میں اس شے سے مطابقت پیدا نہیں کر سکا تھا پتا نہیں کیسے میرے معدے میں زخم ہو گئے تھے۔ حالانکہ کبھی میں نے مرغن مسالے دار کھانے نہیں کھائے تھے ان دو تین سالوں سے ان تینوں کی دوستی میں میرا کھانا اکثر گھر سے باہر ہی ہونے لگا تھا۔

اور میں ذکر کر رہا تھا اس رات کا جب تینوں بالکل حواس گم کیے گاڑی میں غل غپاڑہ کرتے سڑکوں پر الٹی سیدھی گاڑی چلاتے ہلڑ بازی کر رہے تھے ایک ناکے پہ دھر لیے گئے۔

اس دن مجھے گیہوں کے ساتھ گھن کے پس جانے کا محاورہ سمجھ میں آیا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔

میری زندگی کی پہلی رات جو حوالات میں گزری ایک بالکل مختلف تجربہ تھا، وہ تینوں تو شراب کے نشے میں پولیس والوں کو گالیاں بکتے دھمکیاں دیتے ادھر ادھر لڑھک کر مدہوش ہو چکے تھے، جبکہ میں شرمندہ خالی الذہن نادم سا کونے میں سکڑا بیٹھا رہا۔

اور کمال جرأت کی بات یہ ہوئی آدھی رات کے بعد جو میری ذرا آنکھ لگی تو عامر کے والد زبردست سفارش کے ساتھ ان تینوں کو حوالات سے نکال لے گئے اور ان تینوں نے ایک بار بھی مڑ کر میری طرف نہ دیکھا وہ تو جب میری آنکھ کھلی اور مجھ پر یہ قیامت خیز انکشاف ہوا کہ وہ تینوں مجھے چھوڑ کر جا چکے ہیں تو میں حق دق سا بیٹھا رہ گیا۔

میرے ابا اپنے محلے کے سب سے شریف بے ضرر انسان اس صبح نہ جانے کیسے محلے کے معززین کی منت کر کے کونسلر صاحب کو ساتھ لے کر آئے اور مجھے حوالات سے لے گئے۔

"آئے ہائے یہ دن ــــ دن بھی ہماری زندگی میں آنا تھا ایسی شرمندگی ایسی ذلت ارے اس لیے لوگ بیٹوں کی تمنا کرتے ہیں کہ جوان ہوں اور سید ھا باپ کی پگ اتار کر زمانے کے قدموں میں رول دیں، نامراد ایسی تیری پرورش کی تھی میں نے کہ تو یوں جیلوں تھانوں میں راتیں گزار کر زمانے میں ہماری جگ ہنسائی کا سامان کرے مو ل بے حیا۔"

دادی نے آتے ہی مجھے گلے لگانے کے بجائے گھٹنوں سے پیٹنا شروع کر دیا اور مجھے نہ جانے کیا ہوا کون سی طاقت میرے اندر آئی۔ میں نے دادی کے برستے کمزور ہاتھوں کو زور سے جھٹکا دیا اور خود سے پرے دھکیل کر خود اندر بھاگ گیا، یہ دیکھے بغیر کہ وہ نحیف و نزار وجود کس طرح گول لٹو کی طرح گھومتا ہوا برآمدے کے ستون سے جا ٹکرایا ہے ابا اور سیما آپی دوڑ کر انہیں قیمتی متاع کی طرح سینے سے نہ لگاتے تو شاید۔

اس دن کے بعد میرے اور دادی کے بیچ ایک دیوار سی آ گئی۔ پہلے گھر میں ان کے اشعار کی گنگناہٹیں گونجا کرتی تھیں یا جو وہ ہر وقت مجھے لعن طعن کرتی رہتی تھیں اس غیر محسوس سی دیوار کے اٹھ جانے کے بعد گھر میں سناٹے سے گونجنے لگے تھے اگرچہ وہ اب بھی چلتے پھرتے چھوٹے موٹے کاموں کے دوران زیر لب کسی نہ کسی شعر کی گردان کرتی رہتیں مگر اس گنگناہٹ میں پہلے والا دبدبہ نہیں تھا۔

سیما آپی نے ماسٹرز کرنے کے بعد لیکچرار شپ کے لیے اپلائی کر دیا اور ان کی سلیکشن ہو بھی گئی۔ اگرچہ انہوں نے دبے لفظوں میں مجھے دادی سے معذرت کرنے معافی مانگنے کا کہا بھی تھا میں نے ان سنی کر دی۔

مجھے نئی نویلی ملنے والی بے خوف آزادی بہت عزیز تھی نہ نماز کا ڈر اور نہ طعنے تشنے، ہڈحرامی کاہلی بے مقصدیت پر لمبے لمبے لیکچرز سننے کو ملتے تو میں کیوں اپنے ہاتھوں اس آزادی کو گنواتا۔

ابا کی وہی زندگی تھی صبح پراٹھا اور سالن کا ناشتہ کر کے گردن اور کندھے جھکائے جو گھر سے نکل کر دکان پر بیٹھتے دوپہر کو نوکر کھانا ان کی دکان پر لے جاتا اور وہ رات گئے لوٹتے خاموشی سے کھانا کھاتے کپڑے بدلتے اور اپنے کمرے کا رخ کرتے بستر پر لیٹ کر گھنٹوں شاعری کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور پھر پڑ کر سو جاتے۔

اب دادی اٹھتے بیٹھتے دبے لفظوں میں ابا کے آگے میرے بگڑنے آوارہ ہونے مجھے سمجھانے بجھانے دکان پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے انہیں قائل کرنے کی کوشش میں لگی رہتیں ابا نے جواب میں دو تین بار مجھے دکان پر چلنے کو کہا میں نے "اچھا ابا چکر لگاؤں گا۔" کہہ کر ٹال دیا۔ انہوں نے دوبارہ کبھی اصرار ہی نہیں

کیا۔

"اللہ کی جانے کیا منشا ہے کیسی ہیرے جیسی بچی ہے میری اور ایک بار آنے والے جا کر پلٹتے ہی نہیں، بے عیب ذات میرے پروردگار کی ہے جو صاحب جمال ہے اور دیکھنے والے کی نظر میں حسن دیتا ہے ہم بندے تو ناقص و عاجز لاچار و بے بس کیا کر سکتے ہیں، سوائے دعا کے۔"

"ہا دی تم گھر تو ٹکتے نہیں تمہارے امتحان بھی ہونے والے ہیں پڑھتے تو ہو نہیں پتا نہیں تم نے اپنی زندگی کو ایسا بے مقصد کیوں بنا رکھا ہے، ہر عمل کے لیے ہمیں اپنے خدا کے حضور جواب دہ ہونا ہے۔ کچھ تو سوچو۔" میں رات گئے گھر لوٹا اور سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ سیما آپی آگئیں دادی کی جانشینِ خاص ان کا ہر سبق گھول کر پی جانے والی۔

"تو کیا کروں جا کر دکان کی گدی سنبھال لوں وہ کمبخت لوہے کوٹنے کی دھائیں دھائیں سن کر اپنی دماغ کی کوئی شریان فارغ کروالوں اور اس گھر میں دادی کے ہوتے بھلا کون خوش رہ سکتا ہے۔ ان کے لیکچر ان کی نصیحتیں ۔ سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں انہیں کہیں ذرا باہر نکل کر دیکھیں زمانہ 1949ء سے بہت آگے نکل چکا ہے ہمیں اب کوئی پہاڑ سر نہیں کرنا جو یہ رزمیہ اشعار پڑھ پڑھ کر اپنا دماغ خالی کریں فضول کی آئیڈیلزم ۔۔ کون جانتا ہے آج اس "خودی" کے پندار کو نئی دنیا پیدا کرنے کو۔۔۔ اور رہ گئی بے مقصدیت کی بات تو وہ تو میں نے سوچ لیا ہے۔" میں بیزاری سے بولتا چلا گیا۔

"کیا؟ کیا سوچ لیا ہے؟" وہ ہراساں سی ہوئیں۔

"میں باہر جا رہا ہوں عامر کے فادر کا بزنس ہے ادھر کوئی اٹلی میں، میں نے بھی ویزے کے لیے اپلائی کر دیا ہے اٹلی نہ سہی یو کے یا جدھر بھی اس پس ماندہ تضادات سے بھرپور بے ہنگم ملک میں رہ کر مجھے دادی جیسے دماغی مریضوں کے ساتھ رہ کر اپنی زندگی کو بے کار نہیں کرنا۔"

"تم باہر چلے جاؤ گے؟" سیما آپی کا دل چھوٹا تھا فوراً" رنگ زرد پڑ گیا۔

"بالکل۔" میں آرام سے بولا۔

"ابا۔ ابا کو ڈاکٹر نے بائی پاس تجویز کیا ہے ڈیڑھ دو ماہ کے اندر، وہ رک رک کر بولیں تو پل بھر کو میں بھی ٹھٹک گیا۔

"کیوں کیا ہوا ابا کو؟"

"وہ کسی کو بتاتے نہیں تھے بہت دیر سے تکلیف تھی اس دن دکان میں گر گئے ملازموں نے ہسپتال پہنچایا صد شکر کہ زندگی بچ گئی اور اب بائی پاس ہی واحد حل ہے۔"

"تو ٹھیک ہے کروالیں۔" میں بے حسی سے بولا۔

"اس کے بعد بھی مکمل ریسٹ ہی تجویز کریں گے ڈاکٹر تو دکان کون سنبھالے گا؟" وہ سر جھکا کر بولیں تو اس کا فوری جواب مجھے نہیں سوجھ سکا۔

"ملازم ۔۔ پہلے بھی تو وہی دیکھتے ہیں یا پھر وہ چھوڑ دیں۔"

"ابا کے کام کی اصل مانگ ادھر ہے وہ کیسے اپنا آبائی کاروبار چھوڑ سکتے ہیں تم جوان ہو تم کچھ نیا سوچ لو۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولیں۔

"نیا سوچ تو لیا ہے۔" میں اسی ٹون میں بولا۔

"فرار ہے نا؟" وہ طنز سے بولیں۔

"یہ فرار نہیں میری چوائس ہے۔"

"کیا اس گھر میں صرف تم ہو کہ تم اپنی ذات سے ہٹ کر کسی کے بارے میں بھی نہ سوچو کم از کم ابا اور دادی کو۔"

"پلیز آپی! مجھے نیند آرہی ہے میں کسی کے لیے رفیوجی کیمپ نہیں بن سکتا تھا' ابا کہتے ہیں اگر تم دکان سنبھالو تو تمہیں وہ ادھر ساؤنڈ پروف آفس بنوا دیں گے اور فیروز پور روڈ پر چونگی امر سدھو سے آگے جو انہوں نے دو ایکڑ جگہ خرید رکھی ہے ادھر کارخانہ لگا دیں گے جبکہ دکان کو آفس اور ڈس پلے سینٹر میں بدل دیں گے اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" وہ ذرا جوش سے بولیں میرا چہرہ سپاٹ رہا۔

"سوری! مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔" میں نے بے

رخی سے کروٹ بدل لی۔ آپی دل گرفتہ سی اٹھ کر چلی گئیں۔

ان کے کندھے خم زدہ سے ہو رہے تھے اور چال بے حد سست۔۔۔

"آپی کی قسمت ایسی کیوں ہے۔۔۔ میرے اللہ۔۔۔ کوئی خرابی کوئی برائی نہیں اتنی اچھی اتنی خوب صورت پڑھی لکھی بر سر روزگار اور نچلے لیے مثناب سراپے کی مالک اور بار بار کی ریجیکشن میری کیا مصلحت ہے تو ہی جانتا ہے ایک معمولی سا عیب۔۔۔"

ان کے جانے کے بعد بھی بہت دیر مجھے نیند نہ آئی۔

آپی کی دونوں آنکھوں میں اچھا خاصا فرق تھا بہت نمایاں بھینگا پن ہر طرح کا مہنگا سستا علاج کروانے کے باوجود۔۔۔ سب کو رب کی رضا کے آگے سر جھکانا پڑا۔

اٹھارہ برس کی تھیں جب سے دادی نے ان کے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کر رکھا تھا اور اب وہ اٹھائیس کی ہو چکی تھیں اور ابھی تک۔۔۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں، محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز میری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

"سرد ترین برفیلی رات کے بعد پتا نہیں کیسے اتنا روشن چمکیلا دن نکل آیا تھا اٹھارہ گھنٹوں کے دوران برسنے والی سفید برف کی چادر ابھی دبیز نہیں ہوئی تھی اور اب سورج نکل آنے سے کہیں کہیں سے پگھلنے بھی لگی تھی، پگھلتی ہوئی برف پر جب سورج کی شعاعیں پڑتیں تو جیسے رنگوں کا بھرا آئینہ سا ترشنے لگتا، دو دن کی قید کے بعد لوگ بھی اس نئی نویلی دھلی چمکیلی صبح کا استقبال کرنے نکل آئے تھے۔

مال کی دھلی دھلائی چمکتی سڑک پر صبح ہی سے اچھی خاصی چہل پہل تھی میں بھی جلدی ہوٹل کا کمرہ چھوڑ کر نکل آیا تھا آج بھی دادی کے بھوت نے بیداری صبح "کا الارم" بجا کر مجھے جگا دیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی نہ جانے کیسے میکانکی انداز میں، میں نے اٹھ کر صبح کی نماز بھی پڑھ لی تھی اور کھڑکی سے باہر طلوع ہوتی سپیدہ سحر کا اس خوب صورت وادی ڈھلوانوں پر جو دلکش نظارہ تھا کوئی خدا کے وجود کا منکر بھی دیکھتا تو چلا چلا کر اس کے ہونے کی گواہی دے دیتا۔

فہد نہ جانے رات کے کس پہر کمرے میں آیا تھا اور اب ہاتھ پاؤں چھوڑے بے سدھ سو رہا تھا ہم ادھر دو دن اور تھے پرسوں ہمیں یہاں سے کوچ کر جانا تھا، اس کی وجہ نہ تو پیسوں کی کمی تھی نہ فرصت کی بلکہ عامر کا اور میرا پروگرام ایک ساتھ اٹلی جانے کا تھا جبکہ فہد اور رضوان مڈل ایسٹ جا رہے تھے وہ فیصلہ جو میں کئی سالوں سے نہ کر پایا تھا عامر کے پاپا کے اثر و رسوخ اور وزنے کے باسانی حصول نے مجھ سے کروا دیا میں ہلکا پھلکا ناشتہ کرنے کے بعد کافی کا مگ لیے کمال کے سینٹر میں بنے اس سٹنگ پوائنٹ پر آ بیٹھا جہاں سیاح مال کی اترائی چڑھائی والی سڑک سے دم لینے کو بیٹھ جایا کرتے تھے لکڑی اور پتھر کے بنچ جیسے برف کی سلیں بنی ہوئی تھیں۔

"ہیں یہ کیا۔" میری نظریں بالکل غیر ارادی طور پر اوپر اٹھی تھیں میں مری فرسٹ ٹائم نہیں آیا تھا، میرا ادھر کا یہ چھٹا ساتواں وزٹ تھا اس کے باوجود اس بورڈ پر میری نظر آج ہی پڑی تھی۔

اقبال کارپوریشن لائبریری، نیچے بنے پلازے اور سوس شو اسٹور پہ لگا یہ بورڈ پہلی بار میری نظروں کی گرفت میں آیا تھا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کیسے میں کافی کا آدھا مگ لیے آہستہ آہستہ لوہے کی وہ ایک ریلنگ والی تنگ سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

سیڑھیوں کے اختتام پر سفید دروازہ بند تھا اس پر لائبریری کی ٹائمنگ لکھی تھی، صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک، تو نو بج چکے تھے میں نے ہلکا سا ناک کر

کے دروازہ اندر کی طرف دھکیلا۔

سامنے ایک کشادہ بڑا سا ہال کمرہ تھا جس کی چاروں دیواروں اور سینٹر میں ایک رو کی شکل میں کتابوں کی الماریاں تھیں ہال کمرے کے وسط میں بڑے بڑے لکڑی کے میز پڑے تھے جن پر اخبار رسالے اور ڈائجسٹ پڑے تھے جن کے اولین صفحات دروازہ کھلنے پر اندر آنے والی ہوا سے پھڑپھڑانے لگے تھے میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

دروازے کی بغل میں ریسیپشن کا میز اور تین کرسیاں پڑی تھیں، درمیان والی کرسی پر کوئی شخص گرم سویٹر اور گرم شال کے اوپر بھورے رنگ کی اونی ٹوپی اوڑھے دوسری طرف رخ کیے بیٹھا تھا۔

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

ایک گمبھیر بھاری دبدبے والی آواز جیسے اس ہال کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی۔

"ایکسکیوز می میں یہاں تھوڑی دیر بیٹھ سکتا ہوں۔" ہال کمرے کے وسط میں بڑا سا گیس کا ہیٹر جل رہا تھا جس کی وجہ سے فضا خاصی گرم اور سکون آور ہو رہی تھی۔

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اڑا بلبل بے پر کو مذاق پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے

وہی گمبھیر سا لے آواز کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی لے گئی تھی اس لے میں کیسا سحر کیسا جادو تھا کہ میں دم بخود سا آگے بڑھا اور جیسے باادب سا ایک قدم چل کر ہی ٹھٹک گیا۔

اس شخص نے بے حد آہستگی سے رخ پھیرا اور چہرہ میری جانب کیا، مجھے یوں لگا جیسے وہ ہال کمرہ اپنی بھاری کتابوں اور لکڑی کی وزنی شیلفوں سمیت میرے اوپر آن گرا ہو۔

میں پتھر کے بت کی مانند بغیر پلکیں جھپکے ساکت و جامد کھڑا تھا۔

"ہاتھ ٹوٹتے ہیں تمہارے یہ۔۔۔ یہ لکیر۔۔۔ یہ لکیر نہیں۔۔۔ فکر ہے تدبر ہے تفکر ہے اس شخص کی ہزار صدیوں کا نچوڑ اس کی نتھری ہوئی پاک صاف خیالات کا سادہ سا اظہار۔۔۔ اس کی کشادہ پیشانی پر آئی یہ لکیر۔۔۔ محض جھری نہیں چہرہ اقبال کا سب سے قیمتی انمول حاشیہ ہے دوبارہ بناؤ اسے، اقبال کے چہرے کا سب سے قیمتی مگر مشکل زاویہ دھیان دو گے تو بنے گا اسے یونہی پنسل سے مت کھینچو اس پر تھوڑی محنت کرو محنت۔۔۔" ماسٹر فیض محمد میرے آرٹ ٹیچر تھے اور آٹھویں کلاس میں اقبال ڈے پر انہوں نے سب لڑکوں سے اقبال کا پورٹریٹ بنا کر لانے کو کہا تھا اور اس کا رف اسکیچ ہم ساری کلاس ہفتہ بھر پہلے سے بنانا شروع ہو گئی تھی اور ماسٹر صاحب بلا کے نکتہ چیں اور ناقد۔۔۔

ساری کلاس میں میرا اسکیچ ہی کچھ انہیں پسند آیا تھا اس پر بھی اقبال کی پیشانی کی وہ لکیر جس نے مجھے روہانسا کر دیا تھا اور ماسٹر فیض کی چڑچڑاہٹ میں اضافہ۔۔۔ اس لکیر کو بناتے سنوارتے مٹاتے مجھے اقبال کے چہرے کا ایک ایک نقش حفظ ہو گیا تھا۔

اور آج۔۔۔ آج اس ٹھہرے ہوئے انمول لمحے میں میرا حافظہ مجھے کیسے دھوکا دے سکتا تھا۔

میرے سامنے کرسی پر ڈاکٹر محمد علامہ اقبال ہی بیٹھے تھے، وہی تھے وہی ناک نقشہ وہی چہرہ وہی روشن کشادہ پیشانی وہی اٹھی ہوئی ناک اور وہی سرمئی گہری سمندر سی سوچتی آنکھیں۔

"سس۔۔۔ سر۔۔۔ آپ، آپ یہاں، آج اس وقت۔" میری بل کھاتی لڑکھڑاتی زبان سے اٹک اٹک کر بے ربط سے لفظ نکلے تھے اور جواب میں ایک ایسی گہری مسکراہٹ جو بظاہر وجود نہیں رکھتی تھی مگر ان کے چہرے کو کیسا منور سا کر گئی تھی۔

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

رخی سے کروٹ بدل لی۔ آپی دل گرفتہ سی اٹھ کر چلی گئیں۔

ان کے کندھے خم زدہ سے ہو رہے تھے اور چال بے حد سست.....

"آپی کی قسمت ایسی کیوں ہے.... میرے اللہ.... کوئی خرابی کوئی برائی نہیں اتنی اچھی اتنی خوب صورت پڑھی لکھی برسرروزگار اور نیچے لیے تناسب سراپے کی مالک اور بار بار کی ریجیکشن... میری کیا مصلحت ہے تو ہی جانتا ہے ایک معمولی سا عیب....."

ان کے جانے کے بعد بھی بہت دیر مجھے نیند نہ آئی۔

آپی کی دونوں آنکھوں میں اچھا خاصا فرق تھا بہت نمایاں بھینگاپن ہر طرح کا مہنگا سستا علاج کروانے کے باوجود..... سب کو رب کی رضا کے آگے سر جھکانا پڑا۔

اٹھارہ برس کی تھیں جب سے دادی نے ان کے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کر رکھا تھا اور اب وہ اٹھائیس کی ہو چکی تھیں اور ابھی تک..... نیند سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں، محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

"سرد ترین برفیلی رات کے بعد پتا نہیں کیسے اتنا روشن چمکیلا دن نکل آیا تھا اٹھارہ گھنٹوں کے دوران برسنے والی سفید برف کی چادر ابھی دبیز نہیں ہوئی تھی اور اب سورج نکل آنے سے کہیں کہیں سے پگھلنے بھی لگی تھی، پگھلتی ہوئی برف پر جب سورج کی شعاعیں پڑتیں تو جیسے رنگوں کا بھرا آئینہ سا ٹوٹنے لگتا' دو دن کی قید کے بعد لوگ بھی اس نئی نویلی دھلی چمکیلی صبح کا استقبال کرنے نکل آئے تھے۔

مال کی دھلی دھلائی چمکتی سڑک پر صبح ہی سے اچھی خاصی چہل پہل تھی میں بھی جلدی ہوٹل کا کمرہ چھوڑ کر نکل آیا تھا' آج بھی دادی کے بھوت نے بیداری صبح کا الارم بجا کر مجھے جگا دیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی نہ جانے کیسے میکانکی انداز میں میں نے اٹھ کر صبح کی نماز بھی پڑھ لی تھی اور کھڑکی سے باہر طلوع ہوتی سپیدۂ سحر کا اس خوب صورت وادی ڈھلوانوں پر جو دلکش نظارہ تھا کوئی خدا کے وجود کا منکر بھی دیکھتا تو چلا چلا کر اس کے ہونے کی گواہی دے دیتا۔

فہد نہ جانے رات کے کس پہر کمرے میں آیا تھا اور اب ہاتھ پاؤں چھوڑے بے سدھ سو رہا تھا ہم ادھر دو دن اور تھے پرسوں ہمیں یہاں سے کوچ کر جانا تھا' اس کی وجہ نہ تو پیسوں کی کمی تھی نہ فرصت کی بلکہ عامر کا اور میرا پروگرام ایک ساتھ اٹلی جانے کا تھا جبکہ فہد اور رضوان مڈل ایسٹ جا رہے تھے وہ فیصلہ جو میں کئی سالوں سے نہ کر پایا تھا عامر کے پاپا کے اثر و رسوخ اور ورثے کے باسانی حصول نے مجھ سے کروا دیا میں ہلکا پھلکا ناشتہ کرنے کے بعد کافی کا مگ لے کر یہاں کے سینٹر میں بنے اس سٹنگ پوائنٹ پر آ بیٹھا جہاں سیاح اکثر ہی چڑھائی والی سڑک سے دم لینے کو بیٹھ جایا کرتے تھے لکڑی اور پتھر کے بنچ جیسے برف کی سلیں بنی ہوئی تھیں۔

"ہیں یہ کیا۔" میری نظریں بالکل غیر ارادی طور پر اوپر اٹھی تھیں میں مری فرسٹ ٹائم نہیں آیا تھا' میرا ادھر کا یہ چھٹا ساتواں وزٹ تھا اس کے باوجود اس بورڈ پر میری نظر آج ہی پڑی تھی۔

اقبال کارپوریشن لائبریری' نیچے بنے پلازے اور سروس شو اسٹور پر لگا یہ بورڈ پہلی بار میری نظروں کی گرفت میں آیا تھا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کیسے میں کافی کا آدھا مگ لیے آہستہ آہستہ لوہے کی وہ ایک ریلنگ والی تنگ سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

سیڑھیوں کے اختتام پر سفید دروازہ بند تھا اس پر لائبریری کی ٹائمنگ لکھی تھی' صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک' نو تو بج چکے تھے میں نے ہلکا سا ناک کر

کے دروازہ اندر کی طرف دھکیلا۔

سامنے ایک کشادہ بڑا سا ہال کمرہ تھا جس کی چاروں دیواروں اور سینٹر میں ایک رو کی شکل میں کتابوں کی الماریاں تھیں ہال کمرے کے وسط میں بڑے بڑے لکڑی کے میز پڑے تھے جن پر اخبار رسالے اور ڈائجسٹ پڑے تھے جن کے اولین صفحات دروازہ کھلنے پر اندر آنے والی ہوا سے پھڑپھڑانے لگے تھے میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

دروازے کی بغل میں ریسپشن کا میز اور تین کرسیاں پڑی تھیں' درمیان والی کرسی پر کوئی شخص گرم سویٹر اور گرم شال کے اوپر بھورے رنگ کی اونی ٹوپی اوڑھے دوسری طرف رخ کیے بیٹھا تھا۔

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

ایک گمبھیر بھاری دبدبے والی آواز جیسے اس ہال کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی میں یہاں تھوڑی دیر بیٹھ سکتا ہوں۔" ہال کمرے کے وسط میں بڑا سا گیس کا ہیٹر جل رہا تھا جس کی وجہ سے فضا خاصی گرم اور سکون آور ہو رہی تھی۔

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اڑا بلبل بے پر کو مذاق پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اس آگ میں جلنے کے لیے

وہی گمبھیرتا لیے آواز کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی لے آئی تھی اس لے میں کیسا سحر کیسا جادو تھا کہ میں دم بخود سا آگے بڑھا اور جیسے باادب سا ایک قدم چل کر ہی ٹھٹک گیا۔

اس شخص نے بے حد آہستگی سے رخ پھیرا اور چہرہ میری جانب کیا' مجھے یوں لگا جیسے وہ ہال کمرہ اپنی بھاری کتابوں اور لکڑی کی وزنی شیلفوں سمیت میرے اوپر آن گرا ہو۔

میں پتھر کے بت کی مانند بغیر پلکیں جھپکے ساکت و جامد کھڑا تھا۔

"ہاتھ ٹوٹتے ہیں تمہارے یہ.... یہ لکیر.... یہ لکیر نہیں.... فکر ہے تدبر ہے تفکر ہے اس شخص کی ہزار صدیوں کا نچوڑ اس کی نتھری ہوئی پاک صاف خیالات کا سادہ سا اظہار.... اس کی کشادہ پیشانی پر آئی یہ لکیر.... محض جھری نہیں' چہرۂ اقبال کا سب سے قیمتی انمول حاشیہ ہے دوبارہ بناؤ اسے' اقبال کے چہرے کا سب سے قیمتی مگر مشکل زاویہ دھیان دو گے تو بنے گا اسے یونہی پنسل سے مت کھینچو اس پر تھوڑی محنت کرو محنت...." ماسٹر فیض محمد میرے آرٹ ٹیچر تھے اور آٹھویں کلاس میں اقبال ڈے پر انہوں نے سب لڑکوں سے اقبال کا پورٹریٹ بنا کر لانے کو کہا تھا اور اس کا رف اسکیچ ہم ساری کلاس ہفتہ بھر پہلے سے بنانا شروع ہو گئی تھی اور ماسٹر صاحب بلا کے نکتہ چیں اور ناقد....

ساری کلاس میں میرا اسکیچ ہی کچھ انہیں پسند آیا تھا اس پر بھی اقبال کی پیشانی کی وہ لکیر جس نے مجھے روہانسا کر دیا تھا اور ماسٹر فیض کی چڑچڑاہٹ میں اضافہ.... اس لکیر کو بناتے سنوارتے مٹاتے مجھے اقبال کے چہرے کا ایک ایک نقش حفظ ہو گیا تھا۔

اور آج.... آج اس ٹھہرے ہوئے انمول لمحے میں میرا حافظہ مجھے کیسے دھوکا دے سکتا تھا۔

میرے سامنے کرسی پر ڈاکٹر محمد علامہ اقبال ہی بیٹھے تھے' وہی تھے وہی ناک نقشہ وہی چہرہ وہی روشن کشادہ پیشانی وہی اٹھی ہوئی ناک اور وہی سرمئی گہری سمندر سی سوچتی آنکھیں۔

"سس.... سر.... آپ' آپ یہاں' آج اس وقت۔" میری بل کھاتی لڑکھڑاتی زبان سے اٹک اٹک کر بے ربط سے لفظ نکلے تھے اور جواب میں ایک ایسی گہری مسکراہٹ جو بظاہر وجود نہیں رکھتی تھی مگر ان کے چہرے کو کیسا منور سا کر گئی تھی۔

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

”سر آپ۔۔۔ سر آپ علامہ اقبال ہیں نا وہی۔۔۔ وہی۔“

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔۔۔ وہی الہ آباد۔“ کمرے کی گرم فضا میں ٹھنڈک اتر آئی تھی۔

الہ آباد۔۔۔“ ان کے لب ایک حسرت ناک اداسی میں کھلے اور بند ہو گئے۔

”کیسے کیسے خواب سجائے تھے اس امت نے اپنی آنکھوں میں اس جلسے میں اور اس کے بعد۔۔۔ اس پاکیزہ خواب میں رنگ بھرنے کو کیسے بھر بھر کر اپنا لہو انہوں نے پیش کیا تھا اور کیسے بے لوث بے غرض جذبے تھے اور ان جذبوں کا کتنا حسین نتیجہ دیکھا اس زمانے نے۔۔۔ کہ تہہ خاک کے نیچے بھی ہمارے مرقد پر کیسی دائمی بہار اتری تھی۔ صدیوں کا سفر صحرا کی آبلہ پائی کیسے گلستان پر آکر تمام ہوئی تھی۔ اپنے رب سے کیے ہوئے شکوہ کا جواب اتنا حسین ملے گا، یہ نہ میں نے سوچا تھا نہ میری قوم نے۔۔۔ پھر۔“ ان کی سرمئی گہری سمندر سی آنکھیں سامنے دیوار میں ابھرے کسی خلا کو تک رہی تھیں اور بات کے اختتام تک وہ سرمئی سمندر جیسے نیلے پانیوں سے بھر گئے۔

میرا دل اس سمندر میں ہچکولے کھاتی کشتی کی طرح بے قرار ہوا۔

”پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ سر!“ انہوں نے اس گہرے سرمئی سمندر سے پلکیں اٹھا کر مجھے شکایتی نظروں سے دیکھا۔

”مجھ سے پوچھتے ہو پھر کا مطلب۔۔۔“ آواز میں سمندر کی موجوں کا غضب تھا میرا دل ڈوب سا چلا۔

”پوچھو پلٹ کر ان ساٹھ سالوں سے کیا کیا۔۔۔ تم نے ان لہو بھرے چراغوں کے ساتھ پھونکیں مار مار کر بجھا ڈالا اور پوچھتے ہو پھر۔۔۔“ نیلے سمندر جیسے خون رنگ ہو گئے۔

ایک بلبل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

”ہمیں۔۔۔ ہمیں تو جو بھی ملا آپ کے سامنے آدھا کٹا وطن اور وہ بھی مسائل و بحران کے سمندر میں ہچکولے کھاتی کشتی کی مانند۔۔۔ جس پر شکرے نظریں جمائے بیٹھے ہیں ہم سے بعد آزاد ہونے والی اقوام آج تاج سروراں سجائے اقوام عالم پہ راج کر رہی ہیں اور ہم۔۔۔ وراثت میں ملے زخموں کو چاٹ رہے ہیں ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے بے بس و مفلوج۔۔۔ حکومتوں کی غلام گردشوں تک نہ ہماری آہیں پہنچتی ہیں نہ آدرش۔۔۔ ہم لاوارثوں کی طرح بکاؤ مال کی طرح ڈالروں اور پونڈوں کے عوض فروخت ہو جانے والے بے پر بے زبان جانور کیا کریں ہم۔۔۔“ میں پھٹ پڑا۔

میں تجھ کو بتاؤں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

”معاف کیجئے گا سر! حد ادب۔۔۔ آپ کے زمانے جا چکے ہیں شمشیر و سناں کا دور اٹھ گیا“ اور جو جذبۂ ایمانی سے مغلوب ہو کر فتح حق کے سر پہ کفن باندھ کر نکلتے ہیں انہیں آج کی زبان میں دہشت گرد کہا جا رہا ہے اور ہمارے بچوں کو مدرسوں کو مسجدوں کو مارٹر گولوں اور راکٹوں سے بھونا جا رہا ہے ہمیں آواز اٹھانے کا حق نہیں اور انہیں اندھا دھند آگ برسانے سے کوئی روک نہیں سکتا تو ایسے متضاد حالات میں آپ کے اشعار معاف کیجئے زبان و ادب کی صحت کے لیے پڑھنا تو مفید ہو سکتا ہے رزم حق و باطل کی جنگ میں کسی کام کے نہیں۔“ خنک شدید موسم میں بھی میرے جسم سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔

موج ہے دریا اور بیرون دریا کچھ بھی نہیں

”ہاں ہم موج ہی تو ہیں ساحلوں سے سر ٹکراتی آوارہ موج جسے کوئی بھی دریا اپنے اندر سمونے کو تیار نہیں۔

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

”ہمارے گزرے کل نے ہمیں کیا دے دیا، جو آنے والا کل دے گا ہمیں مایوسی کی انتہا پر تھا۔

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں
امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں!
بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا ابراہیم پدر، اور پسر آذر ہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

"یہ سب اشعار سنتے دہراتے یاد کرتے ہمارا بچپن لڑکپن جوانی بڑھاپے گزر گئے کیا حاصل ہوا۔۔۔ یہ بے مقصد زندگیاں یہ رذیل طرز حیات آج دنیا میں ہماری جگ ہنسائی ہو رہی ہے' سب کی نظروں میں ہم سے بڑا ظالم درندہ خونی کوئی نہیں اور ہم۔۔۔ ہم خود کیا ہیں ایک پسی ہوئی مسائل کی زنجیروں میں جکڑی' وسائل کی کمی کے کوڑے کھائی ادھ موئی قوم ہم ان اشعار سے کیا کریں کیا جوش کھائیں۔"

میں بے دم سا ہو کر بڑی کرسی پر گر گیا۔

ان نیلگوں سمندروں میں سرمئی لہریں سی چھلکیں
"تمہاری یہ ردی خستہ حالت دیکھ کر کیا ہم اپنے مرقد میں آرام سے ہیں ہرگز نہیں۔۔۔ تمہیں جو کچھ ورثے میں ملا نقائص' مسائل' بحران۔۔۔ کیا تم بھی ورثے میں یہی کچھ دے کر جاؤ گے بس اس سوال کا جواب خود سے پوچھ لو اور ہر فکر سے خود کو آزاد کر لو۔"

"چنیدہ ہو تم۔۔۔ ایک منتخب قوم۔۔۔ کاش تم خود کو پہچان سکتے اپنی خودی اپنی پہچان کی شناخت کر سکتے لہو کا دریا عبور کر آئے اور پانی کے سمندر میں ڈوبنے لگے' جبکہ تمہارے پاس کشتی بھی ہے' پتوار بھی ہے ضرورت تو صرف اس کشتی اور پتوار کو سنبھالنے کی ہے ۔۔۔ کاش کاش تم سنبھال سکو اپنی آئندہ نسلوں کو وہ ورثہ دے کر جاؤ' جو ہم تمہیں دے کر گئے تھے اور کچھ نہیں تو وہ قرض ہی ادا کر دو۔

چاک اس بلبل تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہد وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادہ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

کمرے کی فضا میں کسی گونج کی طرح وہ گمبھیر لہجہ چکرا رہا تھا اور میں سن سا بیٹھا تھا' یوں جیسے کسی نشے کے زیر اثر میرا دماغ آ گیا ہو' کرسی کی پشت پر سر رکھے میں یک ٹک صدیوں کے اس پیامبر کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

مثل بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

"آپ کیا سو رہے ہیں ہیلو۔" ایک اجنبی آواز پہ میں گہری نیند سے جاگا تھا' سر اٹھا کر ہلانے والے کو دیکھنے لگا۔

ایک اجنبی صورت دراز قد شخص تشویش بھرے انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے ذرا سا رخ پھیر کر سامنے دیکھا تینوں کرسیاں خالی تھیں۔

"ابھی۔۔۔ ابھی یہاں کوئی بیٹھے تھے۔۔۔ سر ۔۔۔ سر اقبال!" میں کنفیوز سا اٹھ کر اس خالی کرسی کے پاس آ کر ہکلاتے ہوئے بولا۔

"کون! سر اقبال۔۔۔ ادھر تو میں ہوتا ہوں یا حیدری صاحب وہ آج آئے نہیں میں بھی ذرا کام سے نیچے گیا تھا۔" وہ بتا رہا تھا اور میں اس خالی بید کی کرسی کو گھورے جا رہا تھا۔

"کیا یہ میرا الوژن تھا۔۔۔ الوژن تھا تو صرف مجھے کیوں دکھائی دیا بلکہ سنائی۔۔۔ سنائی بھی۔"

"تم چنیدہ ہو۔۔۔ منتخب' قوم۔۔۔ تو کیا محض وہ صرف مجھے نظر آئے تو میں منتخب۔۔۔ چنیدہ۔۔۔ مگر کیوں کس مقصد کے لیے۔" میرا سر چکرا رہا تھا اور میں اسی کرسی پر گر سا گیا' وہ شخص حیران نظروں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ابا کا بائی پاس کامیاب ہو گیا اور دادی کے بار بار کہنے پر ابا نے پرانا آبائی گھر بدل کر ماڈل ٹاؤن میں ذرا جدید طرز کا نیا گھر خرید لیا۔

"آخر کب تک بیٹی کو گھر بٹھاؤ گے اچھا گھر دیکھ کر ہی کوئی ڈھنگ کا رشتہ آ جائے گا۔" دادی کی یہ منطق تھی مگر وہ اچھا گھر دیکھ کر بھی ڈھنگ کے رشتے تو آتے مگر وہ لوٹ کر رضامندی کا سندیسہ نہ لاتے۔

یما آپی میری پیاری آپی جنہوں نے اماں کے بعد مجھے کسی آشنے (آشیانے) سے گرے بوٹ (چڑیا کے بچے) کی طرح مجھے اپنی محبت بھری آغوش میں پناہ دی تھی' وہ دن بدن سنجیدہ اور تھوڑی کم صم سی ہوتی جا رہی تھیں مقابل کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے سے گریز ہی کرتیں کہ ان کی آنکھوں کا یہ معمولی سا عیب مقابل کو ان پر مسکرانے کا موقع نہ دے۔

شاید گھر بدلنا بھی کوئی شگن ہوا کہ آپی کی قسمت کا بند دروازہ کھل گیا اس صبح دادی نے ایک مدت کے بعد پہلے کی طرح میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بیداری صبح کے الارم کے ساتھ جگایا۔

"پرسوں نکاح ہے یما کا اللہ رکھے بڑے بھلے لوگ ہیں اس کے کالج میں پڑھتی تھی اس کی شاگرد اپنے بھائی کے لیے پسند کر کے گھر والوں کو لے آئی تم تو گھر میں ٹکتے ہو نہ کوئی خبر رکھتے ہو تمہارے ابا نے بھاگ دوڑ کر کے ساری تحقیق کروائی ہے۔۔۔ ماشاءاللہ پروفیسر ہے سہیل احمد بس ایک بہن کنواری ایک شادی شدہ ہے ایک ماں ہے اور بس خوب کھاتے پیتے پڑھے لکھے ہیں سہیل کو دو ماہ کے لیے ملک سے باہر جانا ہے اس لیے وہ نکاح کرنا چاہ رہے ہیں اور دو ماہ بعد رخصتی ۔۔۔" دادی پہلے والے لاڈ پیار سے خوش خوش مجھے جگاتے ہوئے تفصیل بتائے جا رہی تھیں۔

ابا اور آپی کے اصرار کے باوجود میں ابھی تک ابا کے نئے ساؤنڈ پروف شاندار آفس میں نہیں گیا تھا ابا ابھی گھر پر ہی آرام کر رہے تھے اس مسئلے پر میری دونوں سے تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی اس لیے شاید مجھے اس معاملے کا پتہ نہیں چل سکا۔

"مگر میں تو کل اسلام آباد۔۔۔" میں رک گیا دادی کی خفگی بھری نگاہوں اور متوقع ڈانٹ کے خوف سے۔

"ایک ہی بہن ہے تمہاری' وہ بھی کیسی دکھیاری سی تم ہی اس کے لیے سب کچھ اگر تم شامل نہیں ہو گے تو کیسا دل برا ہو گا اس کا سوچو ذرا۔۔۔"

"میں نے کب کہا میں شامل نہیں ہوں گا' کل

جاؤں گا اور پرسوں ہی آجاؤں گا۔" میں جھلا کر بولا۔
میرے ویزے کے سلسلے میں آبجیکشن لگ کر آیا تھا' بینک اسٹیٹ منٹ کے سلسلے میں اور میرا جانا ضروری تھا۔
آپی تو یونہی مجھ سے روٹھی ہوئی تھیں کہ ان کی نصیحت کے باوجود میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔
میرے لیے ادھر کوئی کشش نہیں تھی سوائے اس ظالم لڑکی کے جو مجھے قطعاً "لفٹ کرانے کو تیار نہیں تھی اور وہ میرے لیے ایسی بھی اہم نہ تھی کہ لفٹ کرا بھی دیتی تو میں اس کی خاطر اپنا ارادہ بدل لیتا' بس یونہی ٹائم پاس کرنے کے لیے کسی ہم رازکی ضرورت تھی' وہ ضرورت تو کیا پوری ہوئی تھی الٹا اس نے مجھے برانگیختہ کردیا اور میں نے انتقاماً "عامر رضوان اور فہد کو اس کی ایک جھلک دکھادی اور وہ حریص گدھ۔۔۔۔ انہوں نے ایک دن بھی صبر نہیں کیا۔
آپی کا نکاح ہوگیا میں نکاح کے بعد رات گئے پہنچا تھا' آپی سے معذرت' ابا سے معافی اور دادی سے تھوڑی ڈانٹ وصول کر میں نے سب کو راضی کر ہی لیا تھا۔

اور اس رات آپی کے نکاح کی تصویروں کا البم لاؤنج میں کھلا تھا میں تو سہیل احمد کے سوا اور کسی سے ملا بھی نہیں تھا اور ہر تصویر میں سہیل احمد اور سیما آپی کے ساتھ کہیں دائیں کبھی بائیں کبھی پیچھے کبھی گھٹنوں کے پاس وہ کیسی بے فکری خوش باش مسکراہٹ سجائے بیٹھی تھی۔۔۔ وہی تھی۔
"آپی۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کون ہے؟" دادی ابا کے ساتھ کہیں جاچکی تھیں میں نے روئی روئی آنکھوں کے ساتھ غمگین سی بیٹھی آپی سے پوچھا انہوں نے لاتعلق سی نظروں سے تصویر کو دیکھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو پھسل پڑے۔
"یہی تو علیزے ہے' سہیل کی بہن کل کالج سے واپسی پر نہ جانے کون تین بدمعاش اسے گاڑی میں بٹھا کرلے گئے اور آج صبح منہ اندھیرے ان کے گھر کے پاس اسے زخمی۔۔۔ مخدوش حالت میں پھینک۔۔۔"
آپی ہچکیوں سے رونے لگیں اور میں تو جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا۔
میں دوسرے ہی دن ان تینوں کے ساتھ منہ چھپا کر گھر میں کسی کو بھی بتائے بغیر مری آگیا۔
مگر میرا چین میرا قرار کہیں پیچھے ہی رہ گیا۔
"اگر آپی کو۔۔۔ اگر سہیل احمد کو۔۔۔ اگر علیزے او مائی گاڈ۔۔۔ ابا میرے سیدھے سادے نیک ابا۔۔۔ میری اقبال کی عاشق دادی۔۔۔ ان میں سے کسی کو بھی پتا چل جائے۔۔۔ کہ میں۔۔۔ میں اسی لٹیروں کے ٹولے کا ایک رکن ہوں۔۔۔ جس نے دلالی تو نہیں کی مگر کوئلے کی کان میں جاکر خود کو بھی کالا کرلیا ہے کون یقین کرے گا کون مانے گا' میں ان تینوں جیسا نہیں یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔ کیسے؟ میں ان کا جگری یار اور ان جیسا نہیں۔
میں کیسے ان سب کا سامنا کروں گا۔۔۔ اور وہ جس کی زندگی محض میرے گھٹیا انتقام کی نذر ہو کر تباہ ہوگئی' وہ اب کسی سے ایسی زندہ دلی سے ایسے ڈھنگ سے لہجے میں بات کرسکے گی' آئندہ دیکھ سکے گی اور آئینہ تو اسے دونوں سے میں بھی نہیں دیکھ سکا۔
"روما ٹھیک کہتی ہے' مجھے اب فیصلہ کرلینا چاہیے۔۔۔ اپنے اور ان کے راستے الگ کرلینے کا۔۔۔ اس سے پہلے کہ میں ان کے ساتھ گناہوں کی دلدل میں دھنستا چلا جاؤں' واپس چلا جاؤں؟"
اس سوال پر آکر پھر میرا دماغ ماؤف ہونے لگتا واپس جاکر کیسے سب کا سامنا کروں گا۔
اس لڑکی سے' اس لڑکی کے بھائی سے جس سے میرا اتنا قریبی رشتہ استوار ہوچکا ہے اپنی پیاری سیما آپی سے کیا کہوں؟
سوچ سوچ کر میرا دماغ پکنے لگا تھا اور میں کوئی فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا۔
مگر آج صبح۔۔۔ آج کی صبح میری زندگی کی نرالی انوکھی صبح تھی' جس نے میرے اندر ایک نئے باہمت باعزم انسان کو پیدا کیا تھا' میں جو مایوسیوں کی اندھیری گلی کے آخری سرے پر کھڑا تھا۔۔۔ پھر سے جی اٹھا تھا۔

میرے رہبر میرے رہنما جس کے عشاق کی فہرست میں یقیناً "میرا نام بہت نیچے تھا مگر اس کا الوژن اس کی شبیہ مجھے ہی کیوں دکھائی دی۔
"تم چنیدہ ہو۔۔۔ منتخب ہو۔ ہاں میں منتخب ہوں خاص۔۔۔ شاید ابھی میرے لیے توبہ کا' ہدایت کا در بند نہیں ہوا یقیناً" میرے لیے ابھی توبہ کی معافی کی گنجائش باقی ہے' جو آخری امید کے طور پر یہ وہ غیب سے میری خصوصی مدد کا اہتمام کیا گیا تو کیا میں راندہ ہوں ٹھکرایا ہوا' درماندہ۔۔۔ رذیل' ہرگز نہیں۔
میں اپنے رب کی نظروں میں خاص ہوں' اہم ہوں جو اتنے گناہوں اتنی لغزشوں کے بعد بھی مجھے سنبھلنے کا موقع دیا گیا۔
فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
تو کیا مجھے موقع دیا گیا' میری قوم کو نہ دیا جائے گا یقیناً "ابھی فلاح کا در' واپسی کا رستہ کھلا ہے۔
ایک پرجوش ولولہ انگیز جذبہ خود کو منوانے کچھ کر دکھانے کا جنون میرے اندر سر اٹھا رہا تھا۔
میں جاکر دادی کو سب کچھ بتا دوں گا' پھر جو وہ کہیں۔۔۔ گناہ گاروں کا حامی تو تھا' سو کفارہ تو واجب ہے سزا بھی ہوئی تو بھگت لوں گا' مگر فرار نہیں ذمہ داریوں اور مسائل سے فرار نہیں۔۔۔ اب فرار کی گنجائش نہیں کسی کے پاس بھی نہیں۔۔۔ مجھے اب سب کا سامنا کرنا ہے ہر مشکل کے ساتھ اسی سرزمین پہ رہ کے۔۔۔۔
اور میں یقیناً "اپنی آئندہ نسلوں کو وہ ورثہ دے کر نہیں جاؤں گا جو مجھے ملا۔۔۔ اس قرض کو چکانے کی سعی۔۔۔ ایک بھرپور کوشش ضرور کروں گا' جو نسلوں کے کندھوں پر دھرا چلا آرہا ہے۔۔۔ میرے رہبر میرے راہنما کیسے ملول ہیں اپنے مرقد میں۔۔۔ اس سے پہلے کہ میں بھی اسی ملال سے گزروں مجھے اس قرض کا کچھ حصہ تو چکانا ہی ہوگا۔۔۔ ہاں' اس مجروح لڑکی کی زخمی روح پر ندامت محبت اور معافی کے پھاہے مجھے ہی رکھنے ہیں۔۔۔ دادی یقیناً "میری مرضی جان جائیں گی۔۔۔ ایک جائز سیدھے رستے کو میں نے اپنی کم عقلی نادانی اور بے حسی سے کیسا ٹیڑھا غلط اور مشکل بنا ڈالا اب اس مشکل کو آسان بنانے کے لیے مجھے ہی کوشش کرنی ہوگی۔"
میں ان تینوں کو بتا کر اپنا بیگ اٹھائے اڈے پر آگیا لاہور جانے والی کوچ تیار تھی۔
مجھے پچھلی سیٹوں میں سے ایک ملی اور مجھ سے دو سیٹیں آگے روما بیٹھی میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی میں نے مسکرا کر منہ دوسری طرف کرلیا۔
اب مجھے کوئلے کی کان سے کوئی سروکار نہیں رکھنا تھا میرا یہ سفر مجھے بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لیے تھا اور میں وہ بھولا سبق یاد کرچکا تھا' کبھی نہ بھولنے کے لیے۔۔۔ ابھی واپس جاکر مجھے بہت کچھ کرنا تھا کم سے کم دو دلوں۔۔۔ نہیں بلکہ زیادہ دلوں کو' جو مجھ سے وابستہ ہیں انہیں اپنے کندن بن جانے کا یقین دلانا تھا میری بے صبری کا' عظم شاید کوچ ڈرائیور کو بھی ہوگیا اور گاڑی چل پڑی۔
جو پیچھے چھوڑ آیا اس کا ملال نہیں تھا جو آگے کی کٹھنائیاں تھیں ان کو عبور کرنے کا عزم تھا اور بس۔ میں نے سر سیٹ سے لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

*